کامل نجات

ہم کیوں المسیح کے پیروکار ہو گئے

برکت اللہ

کامل نجات

ہم کیوں المسیح کے پیروکار ہو گئے

برکت اللہ

kāmil najāt. ham kyoṅ
al-masīh ke pairokār ho gae.

Perfect Salvation. Why We Became
Followers of al-Masih

by Barkatullah
(Urdu—Persian script)

© 2018 Chashma Media
published and printed by
Good Word, New Delhi

Bible quotations are from UGV.

for enquiries or to request more copies:
askandanswer786@gmail.com

1 شیخ احسان اللہ

اُنیسویں صدی کے بیچ میں نارووال ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ دریائے راوی کے شمالی کنارے کے قریب پڑی اِس جگہ تک نہ کوئی ریل اور نہ کوئی پکّی سڑک پہنچتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ساڑھے پانچ سَو سال ہوئے ضلع ملتان کے چند اروڑے ہندو خاندان سیّد جنیب اللہ کے ذریعے مسلمان ہو کر اِس جگہ ٹک گئے۔ سیّد جنیب اللہ کی خانقاہ شہر کے باہر موجود ہے۔

خواجگان کی قوم

یہ مسلمان خواجگان کہلاتے تھے اور شیعہ تھے۔ وہ نماز، روزہ اور دیگر رسوم کے سخت پابند تھے۔ مُحرّم کے وقت تعزیہ نکالنا، ماتم کرنا اور مرثیے پڑھنا اُن کا معمول تھا۔

اُس وقت نارووال کی آبادی تقریباً دو تین ہزار تھی۔ ایک حصّے میں خواجگان کی قوم اور دوسرے حصّے میں ہندو، سکھ اور اہلِ سنّت بستے تھے۔ لیکن کسی قسم کی دُشمنی نہ تھی۔ ہندوؤں، سِکّھوں اور شیعوں میں برادرانہ تعلّقات تھے۔

خواجگان کے سب لوگ بیوپار تھے۔ نارووال تک جانے کی سب سڑکیں کچّی تھیں، اور وہ ہر طرف سے ندی نالوں اور راوی دریا سے گھرا ہوا تھا۔ لہٰذا اُن دنوں میں سفر کرنا عذاب تھا۔ لوگ قصبے کے باہر جانا نہیں چاہتے تھے، اور رفتہ رفتہ قوم کا اکثر حصّہ غریب اور نادار ہو گیا۔ لیکن کسی نے اِس قوم میں کبھی کسی کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا۔

مسیح کے پہلے پیروکار

ایک دن خواجگان کا چودھری شیخ حسین بخش سیالکوٹ گیا۔ وہاں اُس کی مُلاقات کسی سے ہوئی جس نے اُسے انجیل جلیل کی خوش خبری سُنائی۔ اِس پیغام میں کچھ ایسا جادو تھا کہ اُس نے المسیح کے قدموں میں آنے کا فیصلہ کرکے بپتسمہ پا لیا۔ جب وہ نارووال واپس آیا تو اُس کے اپنے اجنبی ہو گئے۔ اُسے طرح طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا، پر وہ ذرا نہ گھبرایا۔ اُس کی رات دن یہی دُعا تھی کہ اُس کے بیٹے بھی المسیح کے فرماں بردار ہو جائیں۔ خدا نے اُس کی دُعا سُن لی۔ وفات سے پہلے اُس کا دوسرا بیٹا اور پھر پہلا بیٹا اپنی بیویوں سمیت خداوند مسیح کے قدموں میں آ گئے۔

تیسرا بیٹا بعد میں المسیح کا پیروکار ہو گیا۔ اُس کی عادت لڑائی جھگڑے کی تھی جس کی وجہ سے لوگ اُسے "کُپتّا" بُلایا کرتے تھے۔ اب اُس کی طبیعت ایسی بدل گئی کہ اُس کا نام "سُپتّا" پڑ گیا۔ چوتھا بیٹا نِکّو شاہ سب کے بعد ایمان لایا۔

1870ء میں ایک پردیسی بنام بیٹمن پہلی بار نارووال آیا۔ وہ خواجگان کے محلّے میں رہنے لگا۔ اُس کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشن سکول کے طالب علم ایک دوسرے کے بعد المسیح کے قدموں میں آنے لگے۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ لیکن فساد اور غوغا کے باوجود یہ جوشیلا مبلّغ اور ہیڈ ماسٹر بھولا ناتھ انجیل کا پیغام سُناتے رہے۔

شیخ احسان علی

اُس وقت خواجگان میں سے بھی کئی ایک خوش حال خاندان اور افراد مسیح کے فرماں بردار ہو گئے تھے۔ شیخ احسان علی بھی اِس قوم کے ایک ایسے فرد تھے۔

شیخ احسان علی کے باپ شیخ بَنیا چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ بڑے زاہد اور متقی تھے۔ اِن ہی وجوہات کے باعث وہ ممتاز اور عزت کے لائق سمجھے جاتے تھے۔ جب اُن کا ذکر کرنا ہوتا تو "جناب بَنیا" یا صرف "جناب" کہتے۔ اُن کا وقت بیشتر مسجد میں کٹتا۔ جب لوگ اُنہیں دُکان پر نہ پاتے تو سیدھے مسجد میں ملنے کو چلے جاتے تھے۔ اُن کی شادی بھی ایک ایسی شریف بی بی سے ہوئی جو

اُن کی طرح نماز، روزہ اور شریعت کی سخت پابند تھیں۔ اُن کے تین بیٹے پیدا ہوئے: احسان علی، رحمت علی اور مُحسن علی۔

جب اُن کے بیٹے چار ایک سال کے ہوئے تو اُنہیں مسجد کے مکتب میں ڈال دیا گیا۔ نتیجے میں جب سیانے ہوئے تو قرآن کے حافظ اور شیعہ مذہب میں پکّے ہو گئے۔ اِدھر ماں باپ دونوں صَوم و صلوٰۃ کے پابند اُدھر مسجد و مکتب کی تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام دے دیا۔

عیسائی ایمان سے نفرت

احسان علی کو علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اب نارووال میں مشن سکول موجود تھا جس میں نارووال کے ہندو، مسلمان، سُنّی، شیعہ اور سکھ لڑکے پڑھتے تھے۔ ارد گرد کے گاؤں کے لڑکے بھی پَیدل چل کر سکول آیا کرتے تھے۔ احسان علی کو پڑھنے کا شوق تھا، لیکن سکول عیسائیوں کا تھا جس میں انجیل کی تعلیم لازمی تھی۔ پہلے تو وہ ہچکچایا، لیکن چونکہ وہ کٹّر شیعہ تھا اُس نے داخل ہونے میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔ سکول کے بعد وہ اپنے باپ کے کاروبار میں مدد دیتا تھا۔

سکول کے طالب علموں کو انجیل کی تعلیم دی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ ہندو مذہب اور اسلام کے اصول پر بھی بحث ہوا کرتی تھی۔ یہ دیکھ کر احسان علی نے انجیل کا مطالعہ کر کے اعتراضات تیار کئے۔ ہر موقے پر وہ سکول کے اُستاد نصرت اللّٰہ کو نہایت گستاخی سے اپنے اعتراض پیش کرتا۔ اِس میں وہ بیٹمن تک کسی کو نہیں چھوڑتا تھا۔ سکول کے اندر اور باہر بازاری مُنادی کے موقعے پر وہ اُن پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتا تھا۔

بیٹمن کے ساتھ سفر

چھوٹی عمر میں ہی احسان علی کی بینائی میں کمی ہو گئی تھی، اور طبیبوں کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اُن دنوں میں نارووال میں کوئی ہسپتال نہ تھا۔ اب بیٹمن اپنے پاس چند انگریزی دوائیاں رکھتا تھا جن سے وہ معمولی امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ اِس وجہ سے احسان علی کبھی کبھی آنکھوں کے علاج کے لئے اُس

کے پاس جایا کرتا تھا۔ ایک روز بیٹمن نے اُسے کہا، ”مَیں ڈاکٹر نہیں ہوں، لیکن اگر تم میرے ساتھ لاہور چلو تو وہاں تمہارا اچھا علاج ہو سکتا ہے۔“

احسان علی راضی ہوا۔ مقررہ روز سے ایک رات پہلے وہ اپنے ایک نزدیکی رشتے دار بنام قربان کو ساتھ لے کر بیٹمن کے پاس پہنچ گیا۔ اُن دنوں میں بیٹمن ایک چھوٹے سے خیمے میں رہا کرتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ایک کی بجائے دو آ گئے ہیں تو اُس نے پوچھا کہ یہ دوسرا لڑکا کون ہے؟

احسان نے جواب دیا، ”یہ میری برادری کا ایک لڑکا ہے۔ چونکہ یہ سچ بولنے کا عادی ہے مَیں اُسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں تاکہ لوگوں میں گواہی دے کہ مَیں آپ کے ساتھ صرف آنکھوں کے علاج کے لئے جا رہا ہوں اور عیسائی ہونا نہیں چاہتا۔“

بیٹمن اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں،

مَیں نے حیران ہو کر کہا، ”کیا تم جیسے جوشیلے مسلمان کے لئے بھی گواہی کی کوئی ضرورت ہے؟“ بہر حال مَیں دونوں لڑکوں کو اپنے چھوٹے سے خیمے میں لے گیا، اور وہ میری چارپائی کے نیچے زمین پر سو گئے۔

آدھی رات کے قریب احسان نے قربان کو جھنجوڑ کر جگایا اور کہا، ”اُٹھ قربان! اُٹھ! نماز پڑھنا نیند سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مُرغ نے بانگ دے دی ہے۔“ لیکن نیند کا غلبہ دونوں پر طاری تھا اور وہ دونوں سو گئے۔ جب صبحِ کاذب نمودار ہوئی اور مُرغ چاروں طرف بانگ دینے لگے تو احسان نے قربان کو پھر جھنجوڑا اور کہا، ”قربان، اب تو اُٹھ۔ اب تو سورج نیزہ بھر اونچا ہو گیا ہے۔“

وہ دونوں تو نماز پڑھنے چلے گئے لیکن مَیں سوتا رہا۔ جب صبحِ صادق نمودار ہوئی تو مَیں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر جا کر دیکھا کہ دونوں لڑکے کنوئیں پر بیٹھے ہیں۔ سلام دُعا کے بعد مَیں نے اُن سے پوچھا، ”کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟“

احسان نے جواب دیا، "ہاں، ہم نے تو پڑھ لی ہے" اور لفظ "ہم" پر زور دیا تاکہ اسلامی وقتِ نماز اور عیسائیوں کی عبادت کے وقت کی تمیز ظاہر ہو جائے اور اسلامی وقت کی برتری ثابت ہو جائے۔

مَیں نے پوچھا، "کیا تم نے خدا سے اُس جھوٹ کے لئے جو تم نے صبح سویرے قربان سے بولا تھا معافی مانگی ہے؟"

اُس نے کہا، "مَیں نے کب جھوٹ بولا ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، "کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ اب تو سورج ایک نیزہ اونچا ہو گیا ہے حالانکہ ابھی مُرغ نے بانگ دی تھی؟"

اِس کا اُس سے کوئی جواب نہ بن آیا۔ قربان مجھے نحیف اور بیمار نظر آتا تھا۔ چنانچہ جب چلنے کا وقت آیا تو مَیں نے احسان کو کہا، "تمہاری آنکھیں کم زور ہیں، لیکن تمہاری ٹانگیں مضبوط ہیں۔ بہتر ہے کہ قربان میرے پیچھے اونٹ پر سوار ہو جائے اور تم پیدل چلو۔" ہم تینوں امرتسر کے راستے لاہور کی جانب چل پڑے۔ مَیں اور قربان اونٹ پر سوار ہو کر آگے نکل گئے اور احسان لمبی چھلانگیں مارتا پیدل چلا آیا۔

دسمبر کے بیچ کے دن تھے۔ سردی بڑی شِدّت کی تھی۔ راہ میں ایک ندی تھی جس کو پار کرتے وقت بیٹمن اور قربان دونوں پانی میں جا پڑے۔ بیٹمن نے پہلے قربان کو پانی میں سے نکال کر اُس کے کپڑے ریت پر سُکھائے۔ پھر ہی اُس نے اپنے کپڑوں کو اُتار کر اُنہیں سُکھایا۔ محبت کے اِس اظہار سے احسان اور قربان دونوں پر بڑا اثر پڑا۔ جب بیٹمن اور قربان کے کپڑے سُوکھ گئے تو وہ دوبارہ اونٹ پر سوار ہو کر امرتسر کی جانب چل پڑے۔ بیٹمن لکھتے ہیں،

ہم دونوں اونٹ پر احسان سے بہت آگے چلے گئے تھے۔ اور یوں ہم دو دن تک اکٹھے اونٹ پر رہے۔ قربان بےچارا بیمار تھا، اور مجھے اُس پر بہت ترس آتا تھا۔ مَیں نے اُس سے ہم دردی ظاہر کی، اور پھر مَیں نے اُسے خداوند مسیح کا پیغام سُنایا جو اُس کے لئے بالکل نیا تھا۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ خداوند مَوت پر غالب آیا ہے اور یوں اُس نے مَوت کا ڈنک

توڑ دیا ہے۔ جب تک ہم لاہور پہنچے قربان حق کا متلاشی بن چکا تھا۔ ہم دونوں نے احسان کو کچھ نہ بتایا، کیونکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ اگر اُسے اُن باتوں کا کہیں علم ہوگیا تو وہ قربان کو زبردستی اپنے ہم راہ واپس نارووال لے جائے گا۔

جب ہم لاہور پہنچے تو مَیں اِن دونوں کو اپنے ایک دوست کے ہاں لے گیا جو بڑا قابل ڈاکٹر تھا۔ احسان کی آنکھوں کو دکھانے کے بعد مَیں نے اُس سے قربان کے لئے دوا مانگی۔ اُس نے دوا تو دے دی لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وہ اِس مُوذی مرض سے نہیں بچے گا۔

جب ہم واپس امرتسر پہنچے تو مَیں ایک دوست کے ہاں ٹھہرا جس نے ایک کمرہ مجھے دیا جبکہ دوسرے کمرے میں اُس نے دونوں لڑکوں کو اُتارا۔ مَیں چاہتا تھا کہ امرتسر میں چند دن رہ کر موقع پا کر قربان کو انجیل جلیل کا پیغام سُناؤں اور احسان کو اِس بات کا پتا تک نہ لگے۔ اِس مقصد کے تحت مَیں احسان کو کسی نہ کسی بہانے سے باہر بھیجتا رہتا تھا۔ بدقسمتی سے مجھے دوسرے روز ہی نارووال سے پیغام ملا کہ میرا فوراً وہاں جانا لازمی ہے۔ میرے اور نارووال کے درمیان تیس میل کا فاصلہ اور دو دریا حائل تھے، اور مجھے واپس فوراً چل پڑنا تھا۔ مَیں نے احسان کو کسی کام پر باہر بھیج دیا اور پھر قربان کو کہا، "مَیں دو دن کے بعد واپس آ جاؤں گا۔ تم یہیں رہنا۔"

اُس نے مجھ سے پہلا سوال یہ کیا کہ اگر آپ چلے گئے تو مجھے کون تعلیم دے گا ؟

مَیں نے اُسے پڑھنے کے لئے کتابِ مقدّس کی ایک جِلد دی۔ اُس نے کتاب کو خوشی سے لے کر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔ لیکن کہنے لگا، "یہ کتاب تو بڑی ہے، اور بھائی احسان اِس کو دیکھ لے گا۔ پھر مَیں کیا کروں گا ؟"

اِس پر مَیں نے اُسے زبورشریف کی ایک جِلد دی۔ اِس کو پا کر وہ کہنے لگا، "یہ کتاب تکئے کے اندر تو چھُپ سکتی ہے، لیکن کیا اِس میں حضرت مسیح روح اللّٰہ کا بھی ذکر ہے؟" کتاب دے کر مَیں نارووال چلا گیا۔

قربان زبوروں کو پڑھ رہا تھا کہ اُسے لیٹے لیٹے نیند آ گئی، اور کتاب کھلی کی کھلی رہ گئی۔ جب احسان واپس کمرے میں آیا تو اُس کی نظر کتاب پر پڑی۔ اُس نے قربان کو جگا کر دُرشتی سے پوچھا، ”یہ کیا ہے؟ تم کو یہ کتاب کہاں سے ملی اورتم نے اِس کو کیوں لیا؟“

اُس نے جواب دیا، ”بیٹمن نے مجھے دی ہے، کیونکہ مَیں نے اُس سے مانگی تھی، اور مَیں مسیح کا پیروکار ہونا چاہتا ہوں۔“

اُس کا یہ کہنا تھا کہ احسان نے اُسے بستر میں سے نکال گھسیٹا اور اپنے ہم راہ نارووال لے گیا۔ اِس واقعے کے تقریباً ایک ماہ بعد مَیں شیعوں کے قبرستان میں سے جا رہا تھا کہ مَیں نے دیکھا کہ لوگ قربان کا جنازہ لئے آ رہے تھے۔

سچائی کی تلاش

احسان علی نہ صرف کٹّر شیعہ تھا بلکہ وہ ایک حسّاس دل اور روشن ضمیر بھی رکھتا تھا۔ جب بیٹمن نے قربان کو ندی سے نکال کر اُس کی خبر گیری کی تو وہ چونک پڑا۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک انگریز نے کیوں تکلیف اُٹھا کر ایک مسلمان بیمار لڑکے کا پہلے خیال کیا، حالانکہ اُس نے قربان کو پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ اُس کا حسّاس دل اُسے قربان کی موت کا بھی کسی حد تک ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ اگر وہ اُسے امرتسر سے گھسیٹ کر زبردستی نارووال نہ لے جاتا تو وہ شاید نہ مرتا۔ پھر وہ اپنے دل کو سمجھاتا کہ اُس نے اپنے طرزِ عمل سے قربان کو جہنّم جانے سے بچا لیا۔ لیکن اُس کا دل اِس قسم کی تسلّیوں کو نہ مانتا۔ پھر وہ یہ سوچتا کہ بیٹمن نے صرف میری آنکھیں دکھانے کے لئے سخت سردیوں کے دنوں میں کیوں ساٹھ ستّر میل آنے اور ساٹھ ستّر میل جانے کی مصیبت اُٹھائی حالانکہ مَیں ہمیشہ اُس سے سخت کلامی اور گُستاخی سے پیش آتا رہا تھا۔ غرض اُس کے دل میں روحانی کشمکش اور ذہنی دقّت شروع ہوگئی جو اُسے کسی حالت میں بھی چَین نہ لینے دیتی تھی۔

دینی تعصب کی وجہ سے احسان علی نے سکول چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اپنے باپ کے کاروبار میں مدد دیتا تھا۔ ساتھ ہی وہ اَجناسِ خوردنی چاول اور گیہوں وغیرہ کی تھوک تجارت کرتا تھا۔ نارووال سے قریب

تین میل کے فاصلے پرمندراں والا گاؤں اعلیٰ قسم کے چاول کے لئے مشہور تھا۔ چنانچہ وہاں سے اور دوسرے دیہات سے وہ اَجناسِ خوردنی خرید کر لاتا اور نفع پرفروخت کرتا تھا۔ نتیجے میں اُس کا خاندان پہلے سے بھی زیادہ خوش حال ہوگیا۔

گاؤں آتے جاتے وقت یہ 17، 18 سالہ نوجوان راہ میں دینی مسائل پرغور کِیا کرتا تھا۔ اُسے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ حضرت مسیح پر جو انجیل نازل ہوئی تھی وہ محرّف ہوگئی ہے۔ اِسی وجہ سے اُس میں تثلیث، اُلوہیّتِ مسیح، کفّارہ اور ابن اللّٰہ جیسی تعلیم موجود ہوگئی ہے اور اُس میں تضاد پایا جاتا ہے۔ پھر اُسے رہ رہ کربیٹمن اورنصرت اللّٰہ کی نرمی، تحمّل، صبر اورمحبت یاد آتی۔ یہ سوال اُس کے دل میں پیدا ہوتا کہ اِس قسم کی تعلیم سے ایسی باتیں کس طرح پیدا ہوسکتی ہیں؟ خود فراموشی، ایثار اور پیارجیسی نیکیاں کیونکر عیسائیوں میں پائی جاتی ہیں؟ اگر اُن کی تعلیم بگڑی ہوئی ہے تو اِس قسم کی نیکیاں اُن میں کہاں سے آگئیں؟ یہ سوچ کر وہ قرآن و انجیل اورشیعہ اورعیسائی دین کی تعلیم کا موازنہ کرنے لگا۔

مسیح کی طرف رجوع

1876ء کا ذکر ہے کہ احسان علی عین دوپہر کے وقت مشن سکول کے ہیڈماسٹر بھولا ناتھ گھوش کے گھر گیا۔ اُن کے بیٹے لکھتے ہیں،

میری عمر قریباً 6 سال کی تھی۔ مَیں اپنے باپ کے پاس کمرے کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔ باہرسخت دھوپ تھی۔ کڑکتی گرمی کے دن تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ ایک اٹھارہ سالہ جوان کمرے کے دروازے کی چک اُٹھا کرشیشوں میں سے اندر جھانک رہا ہے۔ مَیں نے اپنے باپ کو جگایا اور اُٹھ کرلڑکے کے لئے دروازہ کھولا۔ لڑکا اندر آیا اورمیرے باپ کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بات کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ لڑکے کی آواز اونچی اور دُرُشت ہوتی گئی۔ لیکن میرے باپ کی آوازنرم اور دھیمی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکے کو ملائمت سے کچھ سمجھا رہے ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی تھی، لیکن لڑکے کی آنکھوں سے غُصّے کے شرارے نکل رہے تھے۔ یہ گفتگو کوئی چار پانچ گھنٹے جاری رہی جس کے بعد لڑکا چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد مَیں نے اپنے باپ سے پوچھا، "یہ کون تھا اور کیا کہتا تھا ؟"

میرے باپ نے مجھے بتایا، "یہ لڑکا احسان ہے جو عیسائی مذہب کا سخت ترین دُشمن تھا لیکن نامعلوم کیوں۔ اب وہ حق کا طالب ہو گیا ہے اور اسلامی اور عیسائی مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے مجھ سے مدد لینے آیا تھا۔"

احسان علی بیٹمن اور میاں نُصرت اللہ کے پاس اور اپنے مولوی سیّد حسین علی شاہ کے پاس اکثر جانے لگا۔ وہ دینی مسائل چھیڑ دیتا تھا تاکہ راہِ حق کو اختیار کرے۔ کبھی کبھی وہ ہچکچا کر اپنے باپ اور ماں سے بھی دینی مسائل کے بارے میں سوال کرتا، کیونکہ اُس کے دل میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔

اِدھر اُس کا ہم جماعت دینا ناتھ پریتو دِتّا مسیح کا پیروکار ہو چکا تھا۔ میاں سُپتّا اور اُس کے بیٹے رحمت اور احمد مسیح پر ایمان لائے تھے۔ وارث الدین کو بھی پتسمہ ملا تھا۔ اُس کے ہم مکتب حمید الدین، ودھاوا مل اور سُنت شاہ بھی خداوند مسیح کے قدموں میں آ چکے تھے۔ احسان علی اِن لڑکوں سے بھی مذہبی گفتگو کرتا تھا۔ اُس کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ تحریفِ انجیل تھا۔ اگر انجیل محرّف اور منسوخ نہیں ہوئی اور اُس کی صحت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تو اِبنیّتِ مسیح، اُلوہیّتِ مسیح، کفّارہ اور تثلیث وغیرہ کے مسئلے ایمان کی رُو سے ماننے ہوں گے، خواہ انسانی عقل اِن عُقدوں کو حل کر سکے یا نہ کر سکے۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ انسانی اِدراک سے بُلند و بالا ہے۔

یوں احسان علی ہر وقت اِس تلاش میں رہا کہ کیا موجودہ انجیل وہی ہے جو حضرت مسیح لائے تھے۔ اُن دنوں میں فینڈر کی کتاب میزان الحق کا اردو میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ اُس کے مطالعے سے اُس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ جس انجیل کی قرآن بار بار اور جا بہ جا تصدیق کرتا ہے وہ وہی انجیل ہے جو زمانۂ رسول میں عیسائی عربوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اُسی کی ہزاروں نقلیں زمانۂ مسیح سے زمانۂ محمد تک مشرق اور مغرب کے مختلف ملکوں میں موجود تھیں۔ اور اُسی کے ترجمے اُن چھ صدیوں کے دوران بیسیوں زبانوں میں ہر ملک میں مروّج تھے۔ چنانچہ زمانۂ رسول سے پہلے انجیل کی صحت میں فتور ناممکن تھا، جبکہ زمانۂ محمد کے بعد تو یہ بالکل ناممکن تھا۔ اِس لئے انجیل کے بارے میں مولویوں کے خیالات بے بُنیاد ہیں۔

اب اُس نے نئے سرے سے انجیل و قرآن کا گہرا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ خدا سے سچّے دل سے دُعا کرتا تھا کہ اے خدا، مجھے اپنی راہ دکھا اور صراطِ مُستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کر۔ اُس نے شیعہ کُتبِ تفسیر و سِیَر کا غور سے مطالعہ کیا، کیونکہ اہلِ سُنّت کی احادیث اُسے قابلِ اعتراض نظر آتی تھیں جن پر عیسائیوں کے اعتراضات مبنی ہوتے تھے۔

قرآن شریف کی آیات سے اُسے یہ علم ہوگیا کہ خدا رسولِ عربی کو کئی مقامات پر حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے لئے مغفرت کے طالب ہوں اور کہ قیامت کے دن آنخضرت گناہ گاروں کی شفاعت اور سفارش نہیں کریں گے۔ اِس کے برعکس حضرت مسیح کی عصمت پر قرآن و انجیل دونوں گواہ ہیں، اور سب نبی گواہی دیتے ہیں کہ جو کوئی اُن پر ایمان لائے گا وہ اُن کے نام سے گناہوں کی معافی پائے گا۔

گھوش صاحب اور بیٹمن نے احسان علی کو بتایا کہ انجیل تین خداؤں پر ایمان رکھنے کی تعلیم نہیں دیتی بلکہ توحید میں تثلیث اور تثلیث میں توحید پر۔ مسیح خداوند نے صاف صاف فرمایا ہے کہ ایمان دار خدائے واحد اور برحق کو مانیں۔ اور پولُس رسول بھی کہتا ہے کہ ایک کے سوا کوئی خدا نہیں۔ خدا ایک ہی ہے یعنی باپ جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں اور ایک ہی خداوند ہے یعنی عیسیٰ مسیح جس کے وسیلے سے سب چیزیں وجود میں آئیں۔ ابنیّتِ مسیح کے بارے میں اُنہوں نے بتایا کہ انجیل کی رو سے بی بی مریم خدا کی زوجہ نہ تھیں بلکہ اِس خطاب سے روحانی رشتے کا ظاہر کرنا مُراد ہے۔

کفّارے کے متعلق اُنہوں نے کہا کہ اگر گائے، بکری، اونٹ وغیرہ گناہوں کا کفّارہ ہو سکتے ہیں تو مسیح جو "خدا کا لیلا" ہے دُنیا کے گناہ کیوں نہیں اُٹھا سکتا ؟

غرض، دونوں نے مضبوط دلائل سے احسان علی کو تسلّی دینے کی پوری کوشش کی۔

جوں جوں احسان علی مسیح اور انجیلِ مسیح کے قریب آتا گیا اُس کا اضطراب بڑھتا گیا، کیونکہ مسیح پر ایمان لانے کے نتیجے اُس سے چھُپے نہ تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کا پہلوٹھا بیٹا تھا جس سے اُن کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اُس کا خاندان دینی اُمور میں پیش پیش اور سب کے لئے نمونہ تھا۔ ایسے ممتاز خاندان کا وہ چشم و چراغ تھا۔ اگر اُس نے شیعہ مذہب کو ترک کر دیا تو دُنیا کیا کہے گی؟ اُس کے باپ کی ناک کٹ جائے گی۔ اُس کی ماں جس کو وہ حد سے زیادہ پیار کرتا تھا مارے غم کے مر جائے گی۔ دونوں کسی

کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ اُس کے دونوں بھائیوں اور بہنوں کا کیا حشر ہو گا ؟ خاندان کے مختلف افراد کے دل جل جائیں گے۔

کبھی وہ اپنے متعلّق سوچتا کہ میرا مستقبل کیا ہو گا ؟ برادری سے خارج کر دیا جاؤں گا۔ خاندان اور گھر سے نکال دیا جاؤں گا۔ مَیں سب کی طرف سے مر جاؤں گا، اور سب میری طرف سے مر جائیں گے۔ کوئی میرے ساتھ کسی طرح کا سروکار نہ رکھے گا۔ میرا کاروبار تباہ ہو جائے گا، اور مَیں خود تباہ حال، خانہ خراب اور زمین پر آوارہ پھروں گا۔ اِس قسم کے خیالات اُسے شہر کے باہر ویرانے میں لے جاتے جہاں وہ بڑی عاجزی کے ساتھ خدا سے دُعا کرتا کہ اے خدا مجھ پر رحم کر! مجھے اِس گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکال کر اپنے نور میں لے چل۔ میری بے قراری اور بے چینی کو دُور کر، اور مجھے طاقت اور قوّت عطا کر تاکہ مَیں راہِ راست پر چلنے کی توفیق پاؤں، کہ مَیں لعن طعن کی طرف سے بے پروا ہو کر خالص نیّت سے تیری پیروی کروں۔ میرا دل ہر طرف سے خائف ہے، لیکن تُو میرے دل میں سے ہر قسم کا خوف اور اضطراب نکال دے، مجھے دل کا اطمینان اور جان کا آرام عطا کر۔ اے مسیح، تُو سب کو جو بوجھ سے دبے ہوئے ہیں دعوت دیتا ہے کہ میرے پاس آؤ۔ مَیں تم کو آرام دوں گا اور تمہاری جانیں آرام پائیں گی۔ اپنا اطمینان مجھے عطا کر۔

خدا نے آخر کار اُس کی دلی دُعا سن لی اور یشوع کی طرح اُسے فرمایا،

> مَیں تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا، نہ تجھے ترک کروں گا... لیکن خبردار، مضبوط اور بہت دلیر ہو ... مَیں پھر کہتا ہوں کہ مضبوط اور دلیر ہو۔ نہ گھبرا اور نہ حوصلہ ہار، کیونکہ جہاں بھی تُو جائے گا وہاں رب تیرا خدا تیرے ساتھ رہے گا۔ (یشوع 1: 5، 7، 9)

آخر لوگوں کو پتا لگا کہ احسان علی اسلام کو ترک کر کے مسیح کا پیروکار ہونا چاہتا ہے۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ قیامتِ صغریٰ برپا ہو گئی۔ ہر طرف سے لعنت اور پھٹکار کا بوچھاڑ شروع ہو گیا۔ بے چارہ احسان اُنہیں بہتیرا کہتا کہ میرے ساتھ بحث کر لو۔ میری عقل مجھے کہتی ہے کہ عیسائی مذہب ہی اکیلا سچّا دین ہے۔ لیکن اَیسے شخص سے بحث کَون کرے جو بازاری مُنادی میں ہر عیسائی واعظ کا ناک میں دم کر دیا کرتا تھا۔ ایک مَن چلے نے اُسے جواب میں کہا ؂

> صد لعنت و پھٹکار چنیں ذہنِ رسا را
>
> صدہا لعنت اور پھٹکار ایسے تیز ذہن کو۔

احسان اِس قسم کی پنجابی فارسی شاعری پر ہنس دیتا اور جواب میں کہتا ؎

> خدا دارم چہ غم دارم   خدا دارم چہ غم دارم
>
> مجھے خدا حاصل ہے، مجھے کیا غم؟   مجھے خدا حاصل ہے، مجھے کیا غم؟

جب اُس کے خاندان کو اُس کے خیالات کی تبدیلی کا علم ہوا تو باپ نے بہت سمجھایا۔ لیکن وہ ایک نہ مانا۔ آخر باپ نے کہا، "جا۔ گیا گزرا ہوا۔ نامُراد۔"

ماں نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا، "تُو اُس شیطان (بیٹمن) کے پاس کرنے کیا جاتا ہے جو تجھ کو ورغلا کر جہنّم کی طرف لے جا رہا ہے؟ محلّے کی عورتیں کہتی ہیں کہ وہ جو ہے سو ہے، پر اُس نے احسان پر جادو پڑھ دیا ہے۔ تعویذ گَنڈے سے علاج کرو۔"

مَنجھلا بھائی رحمت علی سخت مشتعل ہوا اور طیش میں آ کر لٹھ اُٹھا کر چلا کہ ایسے بھائی کو جان سے مار دینا بہتر ہے جو خاندان کی عزّت و آبرو کا خیال نہیں کرتا۔ برادری کے لوگ اُس سے کنارہ کرنے لگے۔ باپ کو کہا، "جناب، اُسے گھر سے نکال دیں۔ وہ عُضوِ معطّل ہے۔" کسی نے یہ ہوائی اُڑا دی کہ احسان کو کاروبار میں گھاٹا پڑا ہے اور اِس خسارے کی وجہ سے عیسائی ہونا چاہتا ہے۔ کسی نے کہا، "لالچ بُری بلا ہے۔ عقل مندوں کو اندھا کر دیتا ہے۔" کسی نے کہا، "میم سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔"

غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔ لیکن احسان اب وہ احسان نہ تھا جو طیش میں آ کر لوگوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ وہ ہر شخص سے تحمل، صبر اور ملائمت سے بات کرتا اور لعن طعن کا جواب خوش مزاجی سے دے کر ہر ایک کے سامنے انجیل کی صداقت پیش کرتا تھا۔ جو لوگ اُس سے بحث کرنا چاہتے وہ اُنہیں کھلا چیلنج دے کر کہتا کہ اگر تم دلائل سے مجھے قائل کر لو تو مَیں مسیح کا پیروکار نہیں رہوں گا، لیکن اگر تم میری دلیلوں کا جواب نہ دے سکو تو تم بھی میرے ساتھ مسیح پر ایمان لاؤ۔ خواجگان کی برادری اُس کا حال دیکھ

کر حیران تھی کہ کیا یہی وہ احسان ہے جو بازار اورسکول میں کسی عیسائی کوکھڑا نہیں ہونے دیتا تھا اور ہر جگہ اُنہیں پریشان کر دیتا تھا۔

حقہ پانی بند

یہ حالات دیر تک نہیں رہ سکتے تھے اور نہ رہے۔ برادری کے سربراہ احسان علی کے باپ کے پاس گئے اور کہا، ''جناب، آپ اِس لڑکے کو سمجھائیں۔ اُس نے ایک فِتنہ برپا کر رکھا ہے، اور اب حالات ہماری برداشت سے باہر ہو گئے ہیں۔ آپ کی خاطر ہم کو منظور تھی، اِس واسطے ہم نے ابھی تک اُسے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اُس کی زبان بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے کو چیلنج دیتا پھرتا ہے۔ پہلے حسین بخش عیسائی ہو گیا، پھر اُس کے بیٹے پوتے عیسائی ہو گئے۔ وارث عیسائی ہو گیا۔ ارد گرد کے گاؤں کے لڑکے عیسائی ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں، اور اب جناب کے لڑکے نے ہر جگہ اودھم مچا رکھا ہے۔ آپ ہی بتائیں ؎

> کیونکر بُجھے گی آگ یہ گھر گھر لگی ہوئی؟

اگر ہمیں جناب کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم اُسے دو دن میں سیدھا کر لیتے اور فوراً برادری سے خارج کر دیتے۔ اُسے بھی ہوش آ جاتی۔''

احسان کے باپ نے جواب دیا، ''مَیں نے اُسے بہتیرا سمجھایا ہے، لیکن وہ اپنے ارادے کا پکّا ہے۔ وہ نہیں مانا اور نہ کبھی مانے گا۔''

اُنہوں نے کہا، ''پھر بہتر ہے کہ آپ اُسے چھوڑ دیں۔''

''جناب'' کے سینے سے ایک آہ نکلی، اور اُنہوں نے کہا، ''مَیں آخرت کو اِس دنیا پر اور اپنے پہلوٹھے کی محبت پر ترجیح دیتا ہوں۔'' اُنہوں نے احسان کو اِن باتوں کی خبر دی۔

اُس نے جواب میں کہا، ''جناب، مَیں بھی آخرت کو اِس دنیا پر ترجیح دیتا ہوں اور اِسی واسطے سب کچھ چھوڑ کر اور آپ کی، ماں کی اور بھائیوں، رشتے داروں اورعزیز و اقارب کی محبت سے منہ موڑ کر

مسیح کا پیروکار ہو گیا ہوں۔ لیکن آپ اِس بات کا یقین رکھیں کہ مَیں آپ کا وہی تابع دار بیٹا ہوں اور زندگی کے آخر تک آپ کا اور ماں کا فرماں بردار رہوں گا۔"

باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ماں دہاڑیں مار کر رونے لگی اور احسان سے لپٹ گئی۔ آہ و نالہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ وہ بھی رونے لگا۔ بہنیں، رحمت علی اور مُحسن علی سب کے سب زار زار رونے لگے۔ آخر باپ نے کہا، "جب تُو ہماری بات نہیں مانتا تو جو تیری مرضی ہے کر۔ لیکن عیسائی ہو کر تُو گھر میں نہیں رہ سکتا۔ برادری تجھ کو خارج کر دے گی اور تُو کہیں کا نہ رہے گا۔"

احسان نے ایک آہ بھر کر کہا ؎

> ما خدا داریم و ما را ناخدا درکار نیست
>
> ہمیں خدا حاصل ہے، اور ہمیں ناخدا درکار نہیں

وہ گھر سے نکل کر سیدھا بیٹمن صاحب کے پاس گیا اور اُنہیں تمام حالات بتائے اور کہا کہ اب مَیں بپتسمہ پانے کو تیار ہوں۔ چنانچہ 21 اپریل 1878ء کے روز بیٹمن نے احسان علی کو نارووال کی عبادت گاہ میں بپتسمہ دیا۔ اُس کا عیسائی نام احسان اللّٰہ رکھا گیا۔

سکول میں دوبارہ داخلہ

بپتسمہ پانے کے بعد احسان اللّٰہ پیدل سے بٹالہ کے لئے روانہ ہوا۔ اُس کی قوم نے حُقّہ پانی بند کر دیا تھا۔ ماں باپ، بھائی بہن اور عزیز سب بے گانے ہو گئے تھے، لیکن اُس کا دل اطمینان سے پُر اور خوشی سے معمور تھا۔ اُس کا مستقبل تاریک تھا، لیکن اُس کے ایمان کا نور اُس کے پاؤں کا چراغ اور اُس کی راہ کی روشنی تھا۔ اب وہ بیس سالہ نوجوان تھا، اور اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح خدا نے حضرت ابراہیم کو کہا تھا،

> اپنے وطن، اپنے رشتے داروں اور اپنے باپ کے گھر کو چھوڑ کر اُس ملک میں چلا جا جو مَیں تجھے دکھاؤں گا۔ مَیں... تجھے برکت دوں گا۔ (پیدائش 12:1–12)

اِسی طرح خدا نے اُسے بھی اپنے وطن اور رشتے داروں اور اپنے باپ کے گھر سے نکالا ہے، اور وہ ضرور برکت پائے گا۔ بٹالہ پہنچ کر وہ عیسائیوں کے گھر گیا اور اُنہیں بتایا کہ خدا نے اُسے ایمان لانے کی توفیق بخشی ہے۔

اُن دنوں میں بٹالہ کی جماعت میں بیرِنگ، وائٹ بریخٹ، مس ٹکر اور بابو ایشن چندر سنگھا جیسے عظیم لوگ تھے۔ اپریل 1878ء میں احسان اللہ کا بپتسمہ ہوا تھا، اور اِسی اپریل کو بیرِنگ نے اپنا سکول کھولا جس کا پہلا ہیڈ ماسٹر بابو ایشن چندر سنگھا مقرر ہوئے۔

احسان اللہ کی عمر بڑی تھی، کیونکہ وہ اب بیس سال کا نوجوان تھا۔ تو بھی اُسے علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا، اِس لئے بیرِنگ نے اُسے اپنے سکول میں داخل کر لیا۔ سکول میں وہ بڑی محنت سے کام کرتا اور ہمیشہ جماعت میں اول رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اگر کسی روز وہ کسی مضمون میں اوّل نہ رہتا تو وہ ایک بید لے کر سکول کی بالائی منزل پر چلا جاتا اور اپنے آپ کو بید سے پیٹ کر لہو لُہان کر لیا کرتا تھا۔

گناہ سے نجات کا احساس

1880ء احسان اللہ کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس سے اُس کی پوری زندگی بدل گئی۔ اب تک وہ دلائل و بُرہان کے زور سے عیسائی ایمان کا قائل تھا اور ہر ایک کو یہی کہتا تھا کہ میرے ساتھ بحث کر لو اور عقل کے زور سے مجھے قائل کر لو۔ لیکن اِس سال اُسے یہ احساس ہوا کہ دلائل اور بُرہان سے کسی شخص کو گُناہ کے پنجے سے رہائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ خداوند مسیح نہ صرف عقل کا مالک ہے بلکہ دل اور جذبات پر بھی صرف وہی قابو کر سکتا ہے۔ وہی گُناہ گار کو یہ فضل عطا کرتا ہے کہ وہ اپنے گُناہوں پر غالب آئے۔

سکول کے جوان لڑکے طرح طرح کی آزمائشوں میں گر رہے تھے۔ بٹالہ شہر کا ماحول ہی ایسا تھا۔ احسان اللہ خود اِن آزمائشوں کے زور سے واقف ہو رہا تھا۔ یوں اُس پر اب یہ حقیقت مُنکشف ہو گئی کہ میرا آقا

نہ صرف راہ اور حق ہے بلکہ زندگی اور نجات بھی ہے۔ اُس کی صلیب پر سے ایک ایسا چشمہ نکلتا ہے جس میں نہا کر ہر گُناہ گار پاک ہو جاتا ہے۔ یہ احساس احسان اللہ کی زندگی میں زندگی بھر کارفرما رہا۔

بیس سال کے بعد اُس نے یہ وقت یاد کیا،

مَیں شرم کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ پتسمے کے وقت مَیں انجیل جلیل کے اصول کا صرف عقلی طور پر ہی قائل ہوا تھا۔ مجھے اِس حقیقت کا ذاتی تجربہ نہ تھا کہ عیسائی دین کی طاقت ہر انسان کی روحانی زندگی کو تبدیل کر دیتی ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر دو سال بعد روشن ہوئی، جب خدا نے میرے دل کو پکڑا۔ اُس کا پاک نام مُبارک ہو جس نے مجھے اپنا فرزند بنا کر مجھے گُناہوں سے نجات بخشی اور میرے قدموں کو اپنے فرزند کے حیرت انگیز نور میں چلایا۔ اُس سال سے یہ احساس مجھ میں روز بہ روز بڑھتا ہی جا رہا ہے اور مَیں ہر چھوٹے بڑے انسان کو یہی خوش خبری سُناتا آیا ہوں اور سُناتا رہوں گا۔

بٹالہ میں اُستاد

جب احسان اللہ نے کلکتہ یُونیورسٹی کے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر لیا تو بیرِنگ صاحب نے اُسے سکول میں اُستاد مقرر کر دیا۔

احسان اللہ کو اب گھر سے نکلے تین چار سال ہو گئے تھے۔ اُس کے ماں باپ، بھائیوں اور رشتے داروں کی طرف سے نامہ اور پیغام سب بند تھے گویا وہ اُن کی طرف سے مر گیا ہے۔ بٹالہ میں اُس کے رشتے دار تھے، لیکن جوں ہی اُنہیں معلوم ہوا کہ وہ "بے دین" ہو گیا ہے اُنہوں نے اُس کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔

سب سے زیادہ اُسے ماں کی یاد ستاتی تھی جس کو وہ حد سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ وہ اُسے فرشتے سے کم نہ سمجھتا تھا اور زندگی کے آخر تک اُس کی زندگی اور نمونے کے لئے خدا کا شُکر کرتا رہا۔ جہاں خوشی ہوتی تھی وہاں اُس کا یہ بھی جی کرتا تھا کہ ماں کا منہ دیکھے۔ خداوند نے سچ فرمایا تھا،

> یہ مت سمجھو کہ مَیں دنیا میں صلح سلامتی قائم کرنے آیا ہوں۔ مَیں صلح سلامتی نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ مَیں بیٹے کو اُس کے باپ کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں، بیٹی کو اُس کی ماں کے خلاف اور بہو کو اُس کی ساس کے خلاف۔ انسان کے دشمن اُس کے اپنے گھر والے ہوں گے۔ جو اپنے باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنی صلیب اُٹھا کر میرے پیچھے نہ ہو لے وہ میرے لائق نہیں۔ جو بھی اپنی جان کو بچائے وہ اُسے کھو دے گا، لیکن جو اپنی جان کو میری خاطر کھو دے وہ اُسے پائے گا۔ (متی 10:34–39)

لیکن خداوند نے یہ بھی فرمایا تھا،

> جس نے بھی میری اور اللہ کی خوش خبری کی خاطر اپنے گھر، بھائیوں، بہنوں، ماں، باپ، بچوں یا کھیتوں کو چھوڑ دیا ہے اُسے اِس زمانے میں ایذا رسانی کے ساتھ ساتھ سَو گُنا زیادہ گھر، بھائی، بہنیں، مائیں، بچے اور کھیت مل جائیں گے۔ اور آنے والے زمانے میں اُسے ابدی زندگی ملے گی۔ (مرقس 10:29–30)

احسان اللہ نے اِس وعدے کو اپنے حق میں سچ پایا۔ بٹالہ میں سب عیسائیوں کے گھر اُس کے لئے کھلے تھے۔ وہ جہاں جاتا اُس کی آؤ بھگت ہوتی۔ خاص کر بابو سِنگھا کی کوٹھی اُس کا گھر ہو گیا تھا جہاں وہ جس وقت چاہتا بے کھٹکے چلا جاتا تھا۔ بابو صاحب احسان اللہ کے باپ تھے، اور اُن کی اہلیہ اُس کی ماں جو اُس کی ہر طرح سے خبرگیری کرتی تھیں۔ بابو صاحب کے بیٹے راجو اور جوتی احسان اللہ کو اپنا بھائی سمجھتے تھے، اور اُن کی بیٹیاں احسان اللہ کی بہنیں تھیں۔ بیرِنگ صاحب باپ کی طرح اُس پر شفقت کا ہاتھ رکھتے اور وائٹ بریخٹ صاحب اُس سے بھائی کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ مس ٹکر ماں کی طرح اُس سے سلوک کرتی تھی، اور ہر چھوٹا بڑا اُس کی عزّت اور قدر کرتا تھا۔ بیلٹمن بھی اُسے ملنے کی خاطر آ جاتے اور اُس کے حوصلے اور تسلّی کا باعث ہوتے تھے۔ سکول کے طالب علموں میں وہ ہر دل عزیز تھا، اور ہر لڑکا اُس کے لئے اپنی جان دینے کو تیار تھا۔ غرض، احسان اللہ کی زندگی چاروں طرف

محبّت کی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ ہر شخص اُسے پیار کرتا تھا۔ وہ ہر ایک کو پیار کرتا تھا۔ نارووال کے بجائے اب بٹالہ اُس کا وطن ہو گیا تھا۔

احسان اللہ کو اکثر اوقات بٹالہ سے امرتسر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ امرتسر اُن دنوں میں عیسائی ایمان کا گڑھ تھا جہاں مس ہیولٹ، رابرٹ کلارک، ڈاکٹر ہنری مارٹن کلارک، پنڈت کھڑک سنگھ، مولوی عماد الدین لاہز، بابو رُلیا رام، رجب علی جیسے لوگ جماعت میں شریک تھے۔ یہ سب اُس کی خوب مہمان نوازی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ وہ اُن کے پاس بیٹھ کر انجیل جلیل کے رُموز سیکھتا، اُن کی نصیحتوں سے فیض یاب ہوتا اور اُن کی صُحبت سے اپنے عیسائی ایمان میں ترقی کرتا گیا۔ وہ لوگ بھی اُس کے جوش اور بے ریا ایمان سے متاثّر ہوئے۔ یوں اُن سب میں باہمی رشتہء محبّت بڑھتا گیا۔ چنانچہ احسان اللہ نے مسیح کی جماعت کی برادری میں اپنے لئے ایک مُستقل جگہ بنا لی۔ جوں جوں مہینے اور سال گزرتے گئے محبت کے یہ رشتے بڑھتے اور مضبوط ہوتے گئے۔

خادم بننے کی خواہش

اُن دنوں میں میاں احسان اللہ کے چند دوستوں نے اُنہیں مشورہ دیا کہ آپ سرکاری نوکری اختیار کر لیں اور سکول کے کام کو چھوڑ دیں۔ اُنہوں نے کہا کہ آج کل انٹرنس پاس آدمی ملتے کہاں ہیں؟ گورنمنٹ ایسے لوگوں کو جلدی جلدی ترقی دے رہی ہے۔ آپ کا رُتبہ اعلیٰ ہو گا۔ تنخواہ نہایت معقول ہو گی۔ پنشن کا بھی انتظام ہو گا۔ آپ کو سکول کے کام میں نہ تو اچھی تنخواہ ملے گی اور نہ پنشن۔ آپ کی عزّت بھی اِتنی نہیں ہو گی۔ دیکھیں بابو سنگھا کا لڑکا راجو سرکاری نوکری پر لگا ہے، اور اُمید ہے کہ وہ کسی دن اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو جائے گا۔

اُنہوں نے جواب دیا، ”مجھے دولت اور عزّت نہیں چاہیئے بلکہ اصل میں مَیں سکول میں پڑھانا بھی نہیں چاہتا۔“ جب احباب نے پوچھا کہ آخر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں تو اُنہوں نے جواب دیا، ”مَیں اپنی زندگی انجیل کی خدمت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں۔“

ایک دوست نے کہا، "آپ دیکھتے نہیں کہ اب وائٹ بریخٹ صاحب نے بھی چوہڑوں کو پتسمہ دینا شروع کر دیا ہے، اور اب جماعت میں سیالکوٹ، دینا نگر اور گورداسپور وغیرہ سے چُوہڑوں کی بھرتی ہوتی جا رہی ہے؟ اگر آپ خادم الدین بنے تو بس چُوہڑوں کے پِیر ہو جاؤ گے۔"

اُنہوں نے ہنس کر کہا، میرے عزیز بھائی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ بڑے آدمی بنو تو خداوند کے حکم کو یاد رکھو،

> تم جانتے ہو کہ قوموں کے حکمران اپنی رعایا پر رُعب ڈالتے ہیں، اور اُن کے بڑے افسر اُن پر اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تمہارے درمیان ایسا نہیں ہے۔ جو تم میں بڑا ہونا چاہے وہ تمہارا خادم بنے اور جو تم میں اوّل ہونا چاہے وہ سب کا غلام بنے۔ کیونکہ ابنِ آدم بھی اِس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اِس لئے کہ خدمت کرے اور اپنی جان فدیہ کے طور پر دے کر بہتوں کو چھڑائے۔ (مرقس 10:42–45)

نارووال کو واپسی

1889ء میں بیٹمن کی اہلیہ انگلینڈ میں بیمار ہوئی، اور وہ گرمیوں کے موسم میں اُس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اُس نے درخواست کی کہ احسان یہاں کی جماعت اور تبلیغی کام کو سنبھال لے تاکہ مَیں اطمینان سے انگلینڈ جا سکوں۔

جب میاں صاحب کو یہ خبر ملی تو اُنہوں نے خوشی سے اپنا تبادلہ منظور کر لیا۔ اب خدا نے اُنہیں نہ صرف اپنے روحانی باپ اور نارووال کی جماعت کی خدمت کرنے کا موقع دیا بلکہ اپنے رشتے داروں، دوستوں اور عزیز و اقارب کو انجیل جلیل کا پیغام سُنانے کا بھی موقع بخشا۔

میاں احسان اللہ 1889ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ نارووال واپس آ گئے۔ اپنے عزیز وطن میں واپس آ کر اُنہیں جو خوشی نصیب ہوئی اُس کا ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔ نارووال کے در و دیوار سے، اُس کی گلیوں سے، اُس کے سِکھ، ہندو، مسلمان باشندوں سے، لڑکپن کے ہم جماعتوں اور ساتھیوں سے، خواجگان کے چھوٹوں بڑوں سے مل کر اُنہیں خوشی ہوئی۔ لیکن سب سے زیادہ خوشی اُنہیں اپنے باپ

اور خاص کر اپنی ماں سے مُلاقات کرکے ہوئی۔ اُن کا پہلوٹھا بیٹا گیارہ برس کی جُدائی کے بعد اُن سے پھر ملا۔ پُرانے زخم بھر چکے تھے۔ ماضی کی باتیں بھول بسر گئیں اور اب ماں، باپ، بھائیوں، بہنوں اور رشتے داروں نے اُنہیں واپس قبول کر لیا۔

2 بھائی رحمت علی

رحمت علی کو شک آتا ہے

ایک روز کا ذکر ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ احسان اللہ کسی کام کے لئے عبادت گاہ گئے جو محلّہ خواجگان میں واقع تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جب کام ہو چکا تو اُن کے دل میں خیال آیا کہ گھر پاس ہی تو ہے۔ چلو سب کو مل آئیں۔ اُنہوں نے گھر کا کواڑ کھولا۔ سیڑھیوں پر چڑھ کر آواز دی، "بھابھی۔" گھر کے سب بچّے ماں کو "بھابھی" بُلایا کرتے تھے۔

ماں نے اندر سے جواب دیا، "احسان، اندر آجاؤ۔"

وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھے۔ اپنے بھائی رحمت علی کے بچّوں کو گود میں لیا۔ اپنے بزرگ باپ کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ وہ دُکان پر چلے گئے ہیں۔ پھر اپنے منجھلے اور چھوٹے بھائیوں کے بارے میں پوچھا۔ جواب ملا، "رحمت علی اوپر کی منزل میں ہے، اور مُحسن علی باہر اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ پڑھنے گیا ہوا ہے۔"

یہ سن کر وہ اوپر کی منزل اپنے بھائی کو دیکھنے چلے گئے۔ وہاں دیکھتے کیا ہیں کہ رحمت علی سو رہا ہے۔ اُس کے ایک طرف قرآن کُھلا پڑا ہے جبکہ دوسری طرف کتابِ مقدّس پڑی ہے۔ چارپائی کے نیچے قلم دوات اور کاغذ ہیں جس پر کچھ نوٹ لکھے ہیں۔ وہ اُلٹے پاؤں نیچے چلے گئے۔ اُنہوں نے کہا، "بھابھی، رحمت علی کو کہنا کہ آج رات کھانا کھا کر میرے گھر میں آئے۔"

جب وہ رات کو کھانے کے بعد نماز سے فارغ ہو کر آئے تو دونوں بھائی بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ گُفتگو کے دوران بڑے بھائی نے کہا، "بھائی جی، آج مَیں آپ کو ملنے کے لئے گھر گیا تھا۔

آپ سو رہے تھے۔ مَیں نے آپ کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور چلا آیا۔ لیکن مَیں نے آپ کی چارپائی پر کتابِ مقدّس کُھلی پائی۔ کیا آپ اِن دنوں اِس کا مطالعہ کر رہے ہیں؟"

چھوٹے بھائی نے بات ٹالنی چاہی، لیکن بڑے بھائی کے اصرار پر اُنہوں نے کہا کہ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ جب آپ عیسائی ہو کر گھر بار چھوڑ کر نارووال سے چلے گئے تو تمام خاندان کا بوجھ میرے سر پر آ پڑا جو پہلے آپ نے اُٹھایا ہوا تھا۔ باپ مسجد میں زیادہ تر رہتے تھے۔ مُحسن علی 14 سالہ لڑکا سکول میں پڑھتا تھا۔ میری اپنی عُمر 17، 18 برس کی تھی۔ گزارہ بڑی مُشکل سے ہو رہا تھا، کیونکہ چھ سات جانیں تھیں، اور مَیں اکیلا کمانے والا تھا۔ چنانچہ جائیداد کا کچھ حصّہ گِروی کر کے مَیں نے اِس رقم سے بڑے پیمانے پر کاروبار کرنا شروع کر دیا۔ دن رات کی محنت مشقّت پر خدا نے برکت دی۔ نَو دس سال کے اندر مَیں اِتنا سنبھل گیا کہ نہ صرف مَیں نے قرضہ اُتار دیا اور جائیداد واپس حاصل کر لی بلکہ مَیں اچھا تاجر ہو گیا۔ چمڑے کا کاروبار اچھا چل پڑا۔ مَیں امرتسر مال بھیجنے لگا اور وہاں سے مال خرید کر نارووال میں اچھے منافع پر بیچنے لگا۔ اِس کے علاوہ مَیں کپڑے اور نمک وغیرہ میں بھی تجارت کرنے لگا، اور اب خدا کے فضل سے ہم سب بہت زیادہ خوش حال ہیں۔

جب خدا نے میرے کاروبار میں برکت دی تو میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے بھی خدا کی خدمت کرنی چاہیئے، ورنہ یہ احسان فراموشی ہو گا۔ چنانچہ مَیں نے 1887ء میں یہ مصمّم ارادہ کر لیا کہ مَیں عربی زبان سے زیادہ گہری واقفیت حاصل کروں تاکہ قرآن شریف کا صحیح مطلب خود سمجھ سکوں اور اپنی قوم کے لوگوں میں وعظ و نصیحت احسن طور پر کر سکوں۔

اُن دنوں میں مولوی حشمت علی صاحب خیر اللہ پوری مُلکِ عراق سے تعلیم حاصل کر کے واپس آ گئے تھے۔ اب وہ نارووال میں ہی رہتے تھے۔ میری طبیعت متجسّس تھی، اور مَیں واعظوں کے حلقے سے وابستگی رکھتا تھا۔ فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی بنیادی تعلیم سے گزر چکا تھا۔ لیکن یہ تعلیم ایسے ماحول میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گِھرا ہوا تھا۔ چنانچہ مَیں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اُن سے کہا کہ آپ عربی زبان اور شیعہ مذہب کی باریکیوں کو معلوم کرنے میں میری مدد کریں۔

اُنہوں نے کہا، ”تم عربی جانتے ہی ہو۔ تم عربی کا زیادہ علم حاصل کر کے کیا کرو گے؟“

تب مَیں نے اپنا دل کھول کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ خوش ہو کر کہنے لگے کہ وہ مجھے ضرور پڑھایا کریں گے اور شیعہ مذہب کے دقیق مسائل کی بھی تعلیم دیں گے۔ چنانچہ مَیں اکثر اُن کی خدمت میں ہی رہنے لگا اور صرف تھوڑا وقت اپنی تجارت میں صَرف کرتا تھا۔ یہ حال تقریباً دو سال تک رہا۔

مولوی حشمت علی صاحب ہماری قوم کو اکثر وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ وہ عموماً آمدنی کا پانچواں حصّہ دینے پر بہت زور دے کر کہا کرتے تھے کہ پہلے پانچواں حصّہ ادا کر کے اپنے مال کو پاک کرو۔ مَیں اُن کا شاگرد تھا جس کو وہ بہت پیار کرتے تھے، اور ہمارے ہاں اکثر اُن کی دعوت ہوتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ مولوی صاحب کہتے ہیں سب دُرست اور صحیح ہے۔ چنانچہ مَیں بھی پانچویں حصّے کے بارے میں سرگرم تھا۔ ایک سال باپ نے تقریباً دو سَو روپئے پانچویں حصّے کے طور پر اُنہیں دے دیئے۔

کچھ عرصے کے بعد چند عرض دینے والے مولوی صاحب کے پاس آئے جو جسم کے ہٹّے کٹّے مضبوط اور خوب توانا تندُرست معلوم ہوتے تھے۔ وہ خوش پوش اور ذی عزّت دکھائی دیتے تھے۔ مولوی صاحب نے اُنہیں پانچویں حصّے کے اُن روپوں میں سے جو اُن کے پاس جمع تھے اچھی رقم دے دی۔ وہ لے کر بڑے خوش ہوئے اور چلے گئے۔ اِس کے بعد پھر اِسی قسم کے عرض دینے والے مولوی صاحب کے پاس آتے گئے، اور وہ بھی معقول رقمیں حاصل کر کے چلے جاتے تھے۔ اُن میں سے مَیں نے نہ بیمار دیکھے اور نہ غریب، نہ یتیم، نہ بیوہ اور نہ مُسافر پائے۔ چند مہینوں کے بعد مولوی صاحب نارووال سے خیر اللہ پور چلے گئے اور پھر وہیں زیادہ رہنے لگے۔

یہ صورتِ حال دیکھ دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے شروع ہو گئے۔ مَیں نے سوچا کہ ہم لوگ دُکان دار ہیں۔ ہماری بال بچّے والے بھی ہیں، محنت و مشقّت کر کے روزی کماتے اور بال بچّوں کو پالتے ہیں۔ پانچویں حصے کا یہ روپیہ ہم سے وصول کیا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے جو نہ کوئی کام کرتے ہیں نہ کاج۔ اچھے بھلے، ہٹّے کٹّے، موٹے تازے جسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب سے معلوم کرنا چاہیئے کہ یہ کہاں تک جائز ہے کہ پانچویں حصّے کا مال جفاکش محنتی لوگوں سے لے کر ایسے لوگوں کو دیا جائے جو نہ محتاج ہیں اور نہ بیمار، نہ یتیم ہیں، نہ مساکین اور نہ بیوائیں ہیں بلکہ ہم سے بہتر

پوشاک پہنتے ہیں اور ذی عزّت نظر آتے ہیں۔ اِس سوال پر مَیں نے بہت غور کیا اور قرآن شریف کو بھی اچھی طرح سے پڑھا۔ تب مجھ پر حقیقت کُھلی کہ قرآن شریف کے مطابق لُوٹ کے مال میں سے پانچویں حصّے کا ادا کرنا واجب ہے جبکہ ہمارا مال تو لُوٹ کا مال ہی نہیں ہوتا بلکہ محنت مشقّت کی کمائی کا مال ہوتا ہے۔

مَیں اِس سوال پر کئی دن سوچتا رہا۔ آخر ایک بار جب جمعے کا روز قریب آیا تو مَیں نے باپ سے کہا، "یہ سب جائیداد، دُکانیں، گھر بار جو ہے، سب آپ کا ہی ہے۔ مَیں بھی آپ کا ہوں۔ مَیں مولوی حشمت علی صاحب سے پانچویں حصّے کے مسئلے کے بارے میں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔"

اُنہوں نے فرمایا، "اچھا ہے، خیر اللّٰہ پور چلے جاؤ، جمعے کی نماز بھی پڑھ آؤ اور اِس مسئلے کو بھی دریافت کر آؤ۔"

اُس روز چچا غلام تقی موضع خان سے آیا ہوا تھا جو خیر اللّٰہ پور کے نزدیک ہے۔ باپ نے اُس سے ذکر کیا۔ اُس نے کہا کہ بہتر ہے وہ میرے ساتھ چل پڑے۔ وہاں جمعے کی نماز بھی پڑھ آئے اور اپنے دل کے شُکوک کو بھی رفع کر آئے۔ چنانچہ مَیں اُس کے ساتھ چلا گیا۔ رات مَیں نے موضع خان میں بسر کی، اور صبح مَیں اور چچا وہاں سے خیر اللّٰہ پور چلے گئے۔

جب سب لوگ جمعے کی نماز پڑھ کر چلے گئے تب مَیں نے مولوی صاحب سے پانچویں حصّے کے مسئلے کے بارے میں سوال کیے۔ اُنہوں نے کہا، "تم خود جانتے ہو کہ خُمس (پانچویں حصّے) کی آیت قرآن میں موجود ہے۔ یہ ایک الٰہی حُکم ہے جس کو ٹالنا گُناہِ عظیم ہے۔ یہ آیت دسویں پارے کے شروع میں ہے، اور اِس کی صحیح تفسیر یہی ہے کہ ہر ایک چیز میں سے پانچواں حصّہ دینا ہر دین دار پر فرض ہے۔ قدیم زمانے سے اب تک اہلِ شیعہ دیتے چلے آئے ہیں۔"

مَیں نے سوال کیا، "جناب، اگر قدیم زمانے سے پانچویں حصے کا رواج چلا آ رہا ہے تو یہ بتائیں کہ کیا حضرت رسول اللّٰہ صلعم نے کبھی لُوٹ کے مال کے سوا کسی میں سے پانچواں حصّہ لیا تھا؟"

مولوی صاحب بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے، "ہم اِس سوال کا جواب پھر دیں گے۔"

مَیں نے عرض کی، "آپ اپنے وعظ و نصیحت میں پانچویں حصّے پر سالوں سے زور دیتے رہے ہیں۔ مَیں نے صرف دل کی تسلّی کے لئے یہ سوال کئے ہیں۔"

اِس پر وہ بہت ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے، "تم اِتنے سالوں سے میرے شاگرد رہے ہو، اور اب تم میرا یقین نہیں کرتے۔ میرا خیال تھا کہ تم بہت اچھے دین دار شخص ہو کر دوسروں کو وعظ و نصیحت کیا کروگے، لیکن مَیں دیکھتا ہوں کہ شیطان تمہارے سر پر سوار ہو رہا ہے، اور تم بھی احسان کی طرح کافر ہونے لگے ہو۔" اِس کے بعد وہ طیش میں آ کر کہنے لگے، "تم نہیں جانتے کہ ہم مجتہد ہیں؟ ہمارا قول تمہارے لئے کافی ہونا چاہیئے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ ہم کتابوں میں سے تلاش کرکے تمہارے سوالوں کا جواب دیں۔ ہم ایسے ہی عراق عرب کی خاک چھان کر آئے ہیں۔ ہم عالِم اور سیّد ہیں۔ سیّدوں کو اُمّت پر فوقیّت حاصل ہے۔"

مَیں نے پوچھا، "کیا یہ قرآن شریف میں ہے؟"

اُنہوں نے غضب ناک ہو کر کہا، "قرآن مجید میں خدا 23 سپارہ سورہ صافات میں فرماتا ہے،

> سَلَمٌ عَلَى اَل يَاسِينَ۔ (130:37)

تم عربی جانتے ہو۔ اِس کا ترجمہ کرو۔ مَیں نے عرض کی، "سلام ہو اولادِ رسول کے اوپر۔"

اِس کے بعد وہ کہنے لگے، "اب جاؤ اور خدا سے اپنے شک اور شیطانی وسوسوں کے لئے مُعافی مانگو۔ آئندہ جو کلام ہمارے مُنہ سے نکلے اُس پر پکّا یقین رکھو۔"

مَیں یقین کرکے چچا غلام تقی کے ہم راہ واپس موضع خان آ گیا اور ہفتے کے روز نارووال پہنچا۔ اتوار کے روز مَیں نے کلام اللّٰہ کی تلاوت کی۔ تلاوت کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ سورہ صافات کی آیت کو دیکھوں۔ جب مَیں نے اِس آیت کو نکالا تو وہاں آیت کو اِس طرح لکھا پایا،

> سَلَمٌ عَلَى إِلْ يَاسِينَ

اور الفاظ کے نیچے لکھے ترجمے میں یہ الفاظ تھے، "سلامتی ہو، اُوپر اِلیاس کے۔" بھائی جی، مَیں کیا بتاؤں کہ میرا حال کیا ہوا۔ مَیں سنّاٹے میں آ گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی

ہے اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب کا مَیں بڑا معتقد تھا، اور میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ وہ جھوٹ بولیں گے اور قرآن پر تُہمت لگائیں گے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ ممکن ہے کہ مولوی صاحب کی فرمودہ آیت قرآن مجید کے کسی دوسرے حصّے میں موجود ہو۔ چنانچہ مَیں نے تمام قرآن چھان مارا۔ لیکن تلاش اور جستجو کے باوجود وہ آیت کہیں نہ نکلی۔

بھائی جی، مَیں ہر وقت حیران اور پریشان رہنے لگا۔ مَیں بہت گھبراہٹ میں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کروں۔ رہ رہ کر مجھے یہ خیال ستاتا تھا کہ مولوی صاحب نے یہ کیا غضب کیا کہ اپنی بات کو قائم رکھنے کے لئے قرآن تک کو بدل دیا؟ نہ پیٹ بھر کر کھانا کھاتا اور نہ سو سکتا تھا۔ غم اور رنج سے بھرا رہتا تھا۔ ہر وقت یہی خیال آتا کہ مولوی صاحب نے یہ کیا کیا؟ اور اگر ایسے عالِم مجتہد اپنی بات کو منوانے کے لئے قرآن شریف کی آیت کو تبدیل کر سکتے ہیں تو دوسروں کی باتوں پر کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے؟ مَیں شہر کے باہر چلا جاتا، کیونکہ آدمیوں کو دیکھ کر مجھے وحشت سی ہو جاتی تھی۔

ایک شام کو مَیں اِن ہی خیالوں میں غرق تھا۔ روٹی کھانے کو جی نہ کرے، لُقمہ اندر کروں تو باہر نکلے۔ مَیں دو چار لُقمے کھا کر چارپائی پر پڑ گیا، لیکن نیند پاس نہ پھٹکتی تھی۔ آدھی رات کے قریب میری آنکھ لگی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بُزرگ میرے قریب آیا اور مجھے کہنے لگا، "رحمت علی۔ تجھے کیا ہوا ہے؟ تُو کیوں اِس قدر غمگین اور پریشان حال ہو رہا ہے؟"

تب مَیں نے اُسے اپنی تمام کہانی سنائی اور کہا، "میرا مولوی صاحب پر پورا یقین تھا، لیکن اب اُنہوں نے اپنی بات رکھنے کی خاطر قرآن شریف کی آیت کو بدل دیا ہے۔ ہائے، مَیں کیا کروں؟" مَیں بڑے زور سے رونے لگا۔

اُس بُزرگ نے بڑے اطمینان اور دلجمعی سے جواب دیا، "تُو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ عربی، فارسی اور اردو تُو اچھی طرح جانتا ہے۔ قرآن و حدیث سے تُو واقف ہے۔ تُو کتابوں کو خود کیوں نہیں پڑھتا؟ تُو انسان پر کیوں ایمان رکھتا ہے؟ تم کسی آدمی پر اعتبار نہ کرو۔ خود پڑھو، سوچو، سمجھو اور جو دُرست ہے اُس پر عمل کرو۔"

میری فریاد اور رونے کی آواز سے والدین جاگ پڑے۔ بھابی میرے پلنگ آئی اور کہنے لگی، ”رحمت علی۔ کیا ہوا ہے؟ ایسا کیوں کرتے ہو؟“

مَیں بھی اُٹھ بیٹھا اور اپنے آنسو پونچھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سونے چلی گئی اور مَیں پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اُس بزرگ کی باتوں پرسوچتا سوچتا سو گیا۔

جب مَیں صبح سویرے اُٹھا تو مَیں نے مصمّم ارادہ کرلیا کہ مَیں اِس بزرگ کی صلاح پر عمل کروں گا۔ خواہ کوئی شخص کچھ کہے مَیں کسی بات کونہیں مانوں گا جب تک کہ قرآن اورمیری عقل اِس کی گواہی نہ دے۔ مَیں نے وُضو کیا اور صبح کی نماز کے بعد دُعا کی کہ اے خدا، تُو ہی ہر بات میں میرا ہادی ہو۔ تیرے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ مَیں نے قرآن کو نئے سرے سےغور و خوض سے پڑھنا شروع کیا۔ سورہ فاتحہ کو ختم کرکے سورہ بقر کو پڑھنا شروع کیا۔ جب مَیں اِس آیت پر آیا،

> وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ (4:2)
>
> اور جو اُس پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر نازل ہوا اور جو تجھ سے پہلے نازل ہوا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ پڑھ کر مَیں ٹھٹھک گیا۔ مَیں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا مَیں کتابِ مقدّس پرقرآن کی طرح ایمان رکھتا ہوں؟ مَیں اِس آیت کے آگے نہ پڑھ سکا۔ یہ آیت مَیں نے بیسیوں مرتبہ پڑھی تھی لیکن میرے دل میں اِس قسم کا خیال پہلے کبھی نہ آیا تھا، کیونکہ عالموں سے یہی سُنا کرتا تھا کہ مروّجہ کتابِ مقدّس خدا کا کلام نہیں ہے۔ چنانچہ میرا بھی یہی خیال تھا کہ یہ کتابِ مقدّس آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے اور اِس قابل نہیں رہی کہ اِس پر ایمان لایا جائے۔ لیکن اب تو مَیں نے دل میں ٹھان رکھا تھا کہ مَیں کسی عالِم اورمولوی کی بات نہیں مانوں گا۔ مَیں صرف قرآن اورعقل کی باتوں پر ہی چلوں گا، سب کچھ خود پڑھوں گا، سب باتوں پرخود سوچوں گا۔ مَیں خدا سے مدد پا کر سمجھنے کی کوشش کروں گا اورصرف راستی پر عمل کروں گا۔ کیونکہ شیخ سعدی نے کہا ہے ؎

راستی مُوجبِ رضائے خداست   کس ندیدم کہ گُم شُد از رہِ راست۔
راستی خدا کی رضامندی کا سبب ہے
مَیں نے کسی کو بھی نہیں دیکھا جو راہِ راست پر چلتے ہوئے گُم ہو گیا ہے۔

اِس آیت کو پڑھ کر میرے دل میں سخت کشمکش شروع ہو گئی۔ پرانے خیالات میں اور نئے خیال میں سخت لڑائی شروع ہو گئی۔ مَیں نے اپنے آپ کو بہت ملامت کی اور کہا، ”جس کتاب کو تُو آدمیوں کا کلام خیال کرتا ہے اُسے قرآن شریف خدا کا کلام فرماتا ہے۔“ مَیں نے اُس گھڑی مان لیا کہ جیسا مَیں قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہوں ویسا ہی کتابِ مقدّس پر ایمان رکھوں گا۔ اور جیسا مَیں قرآن کی تلاوت روزانہ کرتا ہوں اُس کی بھی تلاوت روزانہ کروں گا۔ مَیں دونوں کتابوں کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کروں گا۔

بھائی جی۔ آپ یہاں نہیں تھے کہ مَیں آپ سے مدد مانگتا۔ اگر آپ یہاں ہوتے تو مجھے اِس قدر پریشانی کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ اور آپ میری راہنمائی بھی کر سکتے تھے۔

خیر، مَیں نے قرآن مجید کو وہیں بند کر دیا اور اُسی روز کتابِ مقدّس کی ایک جِلد خرید کر دونوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں مَیں دونوں کا مطالعہ کرتا گیا مجھ پر یہ ظاہر ہوتا گیا کہ کتابِ مقدّس کے بہت سے مقامات اور قِصّے قرآن میں پائے جاتے ہیں اور قرآن کی آیات کو سمجھنے میں تفسیروں سے زیادہ مدد دیتے ہیں۔ لیکن مجھے دونوں کتابوں میں اختلافات بھی نظر آنے لگے۔ اب مَیں نے دو موٹی کاپیاں بنائیں۔ ایک قرآن مجید کے لئے اور دوسری کتابِ مقدّس کے لئے بنائی۔ جن آیتوں اور مقاموں کا آپس میں میل نہیں ہوتا وہ مَیں نے اُن کاپیوں میں درج کرنی شروع کر دی ہیں۔ جب آپ آج دو پہر کو گھر آئے تھے تو مَیں دونوں کتابوں کو پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ اب مَیں نے آپ کے سامنے تمام حالات حرف بہ حرف بیان کر دیئے ہیں۔

بڑا بھائی خاموشی سے چھوٹے بھائی کی باتیں سُنتا رہا۔ جب وہ اپنا قِصّہ سُنا چُکے تو بڑے بھائی کہنے لگے، ”بھائی جی۔ مجھے آج آپ سے بڑی شرم آتی ہے۔ مَیں نے عیسائی ہونے کے وقت یہ خیال نہ

کیا کہ مَیں گھر بار دُکان وغیرہ کا سارا بوجھ آپ پر لاد رہا ہوں۔ میری وجہ سے جو آپ کو تکلیف پہنچی اُس کے لئے میں معافی مانگتا ہوں۔ لیکن اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ طالبِ حق کی راہ میں مُشکلات کا پہاڑ حائل ہوتا ہے، کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب اُسے رشتے داروں کی محبّت اور خدا میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ انجیل میں لکھا ہے کہ تم خدا اور دنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ مَیں نے خدا کی خدمت اختیار کی، اور مجھے یہ نظر آتا ہے کہ آپ کو بھی خدا حق کی جانب بُلا رہا ہے اور آپ اپنے طریقے سے خدا کی طرف آ رہے ہیں۔ خداوند نے فرمایا ہے کہ صراطِ مستقیم، حق اور زندگی مَیں ہوں۔ چنانچہ حق کی تلاش آپ کو اپنے نجات دہندے کے پاس لا کر رہے گی۔ آپ پنجگانہ نماز میں سورہ الحمد پڑھ کر خدا سے دُعا مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو صراطِ مستقیم پر چلائے۔ مَیں ہمیشہ آپ کو اپنی دُعاؤں میں خدا کے حضور پیش کرتا رہوں گا۔ اگر مَیں کسی وقت آپ کے مطالعے میں کام آ سکوں تو مجھے بتائیں تاکہ مَیں آپ کی مدد کروں۔ فی الحال آپ یہ چند کتابیں پڑھنے کے لئے لے جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور چھوٹے بھائی کو میزان الحق اور اثارِ شیرین وغیرہ کتابیں دے کر کہا، "آپ کو اِن کتابوں کے مطالعے سے فائدہ پہنچے گا۔ یہ باتیں کہ کتابِ مقدّس محرّف ہے اِن مولویوں کی بناوٹی باتیں ہیں۔ ؎

> چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند۔
> چونکہ اُنہیں حقیقت نظر نہیں آتی تھی اِس لئے وہ افسانے گڑھتے تھے۔

قرآن سے ایسی باتوں کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اِس قسم کی باتوں سے نہ قرآن میں اور نہ انجیل میں تحریف لازم آتی ہے۔ بھائی جی۔ آپ نے خود تحقیق کرنے کا جو راستہ اختیار کیا ہے وہ بہترین راستہ ہے۔ اگر کسی بات میں میری ضرورت پڑے تو آپ بنا ہچک مجھے بتائیں۔ میری دُعا ہے کہ خدا آپ کو اِس پُرخار راستے میں بےخوف ہو کر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔" رات بہت گزر گئی تھی، چنانچہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے۔

رحمت علی قرآن اورکتابِ مقدّس کا غور سے گہرا مطالعہ کرتے رہے۔ وہ جوں جوں مطالعہ کرتے گئے اُنہیں کتابِ مقدّس کی صداقت کا یقین ہوتا گیا۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت کتابِ مقدّس اور خاص کر انجیل جلیل کے پڑھنے میں صَرف کرنے لگے۔

زلزلہ اور وبا

1905ء کا سال نارووال کے لئے ایک بڑا منحوس سال تھا۔ اُس سال پنجاب بلکہ تمام شمالی ہند میں مارچ میں سخت زلزلہ آیا جس نے کانگڑہ کے ضلع سے لے کر تمام شمالی ہند میں تباہی مچا دی۔ نارووال میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جو گِرا نہ ہو یا جس کی دیواریں شکستہ نہ ہوئی ہوں۔ زلزلے کے جھٹکے صبح سے شروع ہوئے اور مسلسل تمام دن جاری رہے۔ لوگ اپنے گھروں سے بھاگ نکلے۔ اُنہوں نے ویران مقاموں میں درختوں کے سائے کے نیچے پناہ لی۔ محلّۂ خواجگان برباد ہوگیا۔ ہرشخص خدا سے دُعا کرنے لگا۔

رحمت علی انجمنِ شیعاں کے صدر تھے۔ اُنہوں نے تمام محلّے کو عید گاہ میں بُلایا۔ لوگوں کا بڑا بھاری مجمع اکٹھا ہوگیا۔ وہاں شیخ صاحب نے کتابِ مقدّس میں سے یونس نبی کی کتاب پڑھ کر سُنائی اور پھر ایک دل ہلا دینے والا وعظ کیا۔ تمام مجمع کے دل خدا کی جانب رجوع ہوگئے۔ اُنہوں نے نہایت فروتنی کے ساتھ دُعا کی اور توبہ کی طرف مائل ہو کر خدا سے اپنے گُناہوں کی معافی مانگی۔

ابھی زلزلے کی ہراسانی ختم نہ ہوئی تھی کہ طاعون کی وبا محلّۂ خواجگان میں پھیل گئی۔ ہر گلی کوچے کے لوگ مرنے لگے۔ عیسائی آبادی سے باہر نکل گئے۔ رحمت علی نے انجمن کے صدر کی حیثیت سے سب کو یہی کرنے کی صلاح دی اور پھر عیدگاہ میں تمام شیعوں کا مجمع اکٹھا کیا۔ اِس موقعے پر اُنہوں نے تقریر کی جس میں کتابِ مقدّس سے جا بہ جا حوالے دے کر انبیا کے نصیحتیں اور تورات کی کتاب استثنا کے حوالجات پڑھے۔ اُنہوں نے خدا سے دُعا کی کہ وہ سب پر رحم کرے، سب کے گُناہ مُعاف فرمائے اور وبا کو جو نارووال کے لوگوں کی واجبی سزا کے طور پر بھیجی گئی ہے اُن کے درمیان سے دُور کرے۔

خدا نے اپنا فضل کیا۔ چند دنوں کے اندر طاعون کی وبا ختم ہوگئی۔ شیخ صاحب کی اہلیہ بھی اِس نامُراد مرض میں گرفتار ہو کر اُن دُعاؤں کے سبب سے صحت یاب ہوگئیں۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں،

میری بیوی سخت بیمار ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دم کی مہمان ہے۔ ہم نے برکت علی کو بٹالہ کے سکول میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا تھا، اور وہ اُس کی جُدائی میں بھی تڑپ رہی تھی۔ مَیں نے دُعا مانگی کہ اے خداوند، مَیں تیری مِنّت کرتا ہوں کہ تُو اپنے مسیح کے نام کی خاطر اِس کو شفا بخش۔ دُعا کے بعد اُسے قدرے آرام ہوگیا۔ اُس کی بے ہوشی دُور ہوگئی۔ وہ بات چیت کرنے لگی، اور مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ چند دنوں کے بعد اُس کی کم زوری بھی ختم ہوگئی، اور اُس نے خدا سے نئی زندگی پائی۔

اپنے ایمان کا علانیہ اقرار

زلزلے کے جھٹکوں اور طاعون کی وبا نے شیخ صاحب اور اُن کی رفیقۂ حیات کے دلوں میں اِس دُنیا کی ناپائے داری اور دَولت کی کم مائگی کا احساس بہت تیز کر دیا۔ نتیجے میں رحمت علی زیادہ وقت کتابِ مقدّس کے مطالعے میں صَرف کرنے لگے اور دُکان میں صرف اُتنا کاروبار کرتے جس سے اُن کے مطالعے میں ہرج واقع نہ ہوتا۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں،

کتابِ مقدّس کے مطالعے میں مجھے عجب لذّت آنے لگی۔ مَیں ہر وقت اِسی کو پڑھنے لگا۔ ایک روز مَیں کتابِ مقدّس کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میری بیوی جو اَن پڑھ ہے مجھے کہنے لگی، "آپ مجھ سے کبھی بات نہیں کرتے۔ جب دیکھتی ہوں، بس آپ ہیں یا یہ کتاب ہے۔"

مَیں نے جواب دیا، "ہاں، بولو۔ کیا بات ہے؟ تم بے شک بات کرو۔"

اُس نے کہا، "بات کیا دیواروں سے کروں؟ یہ کتاب تو آپ کے مُنہ کے سامنے ہے۔" اور پھر بڑے جوش میں آ کر کہنے لگی، "جی کرتا ہے کہ اِس کتاب کو جلا کر راکھ میں ملا دوں۔ یہ کتاب ہے یا آپ ہیں؟" یہ کہہ کر میرے ہاتھ سے کتابِ مقدّس چھیننے لگی۔

مَیں نے کہا، "اِس کتاب کو عزّت سے ہاتھ لگاؤ۔ یہ خدا کا کلام ہے۔"

اُس نے گھبرا کر کہا، "کیا یہ قرآن شریف ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، ”نہیں، یہ کتاب قرآن نہیں ہے۔ یہ کتابِ مقدّس ہے جو خدا کا سچّا کلام ہے۔“

اُس نے پوچھا، ”تو کیا قرآن خدا کا کلام نہیں ہے؟“

مَیں نے جواب دیا، ”میرا ایمان تو یہ ہے کہ صرف یہی کتاب خدا کا سچّا اور الہامی کلام ہے۔“

اُس نے کہا، ”اگر آپ کا یہی ایمان ہے تو مجھے بھی اِس میں سے سُنایا کریں تا کہ مجھے بھی تو کچھ پتا لگے۔“

مَیں نے خدا کا شُکر کیا اور اپنی بیوی کو خداوند مسیح کی زندگی اور تعلیم، اُس کی صلیبی موت اور قبر میں سے تیسرے روز جی اُٹھنے کا حال سُناتا رہا۔ مَیں ہر شام اُسے کتابِ مقدّس کے بزرگوں کی کہانیاں اور انبیا کے کارناموں کا حال پڑھ کر سُنایا کرتا تھا۔

صبح کے وقت مَیں اپنے کاروبار کو چلا جاتا اور فراغت کا وقت قرآن اور کتابِ مقدّس کے موازنے اور مقابلے میں صَرف کرتا تھا۔ جب مَیں اپنے اعمال کی طرف نظر کرتا تو میرے گُناہ میرے سامنے آ جاتے۔ نماز کے وقت جب مَیں کعبہ کی جانب رُخ کرتا تو غالب کا شعر مجھے یاد آتا ؎

> کعبہ کِس مُنہ سے جاؤ گے غالب   شرم تم کو مگر نہیں آتی؟

لیکن مَیں اپنے دلی خیالات دوسروں پر علانیہ ظاہر نہیں کرتا تھا، کیونکہ مَیں لوگوں سے ڈرتا تھا۔ ظاہر میں اسلامی رسوم کا پابند تھا، لیکن باطن میں میرا ایمان انجیل جلیل پر قائم تھا۔ جب میرے دل میں کشمکش ہوتی تو مجھے خداوند مسیح کے قول سے تسلّی ہو جاتی کہ

> جو ہمارے خلاف نہیں وہ ہمارے حق میں ہے۔ (مرقس 40:9)

مَیں شیعہ تھا، اِس لئے مجھے تقیّہ یعنی ظلم کی وجہ سے اپنا عقیدہ چھُپانے کی اجازت تھی۔ کئی برس تک یہ باتیں میرے دل کو غلط تسلّی دیتی رہیں۔

ایک رات کا ذکر ہے مَیں اپنی بیوی کو انجیل متی کا دسواں باب سُنا رہا تھا۔ مَیں اِن آیات پر آیا،

> اُن سے خوف مت کھانا جو تمہاری روح کو نہیں بلکہ صرف تمہارے جسم کو قتل کر سکتے ہیں۔ اللہ سے ڈرو جو روح اور جسم دونوں کو جہنم میں ڈال کر ہلاک کر سکتا ہے۔ کیا چڑیوں کا جوڑا کم پیسوں میں نہیں بِکتا ؟ تاہم اُن میں سے ایک بھی تمہارے باپ کی اجازت کے بغیر زمین پر نہیں گر سکتی۔ نہ صرف یہ بلکہ تمہارے سر کے سب بال بھی گنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا مت ڈرو۔ تمہاری قدر و قیمت بہت سی چڑیوں سے کہیں زیادہ ہے۔
>
> جو بھی لوگوں کے سامنے میرا اقرار کرے اُس کا اقرار مَیں خود بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے کروں گا۔ لیکن جو بھی لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے اُس کا مَیں بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے انکار کروں گا۔
>
> یہ مت سمجھو کہ مَیں دنیا میں صلح سلامتی قائم کرنے آیا ہوں۔ مَیں صلح سلامتی نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ مَیں بیٹے کو اُس کے باپ کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں، بیٹی کو اُس کی ماں کے خلاف اور بہو کو اُس کی ساس کے خلاف۔ انسان کے دشمن اُس کے اپنے گھر والے ہوں گے۔
>
> جو اپنے باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ پیار کرے وہ میرے لائق نہیں۔ جو اپنی صلیب اُٹھا کر میرے پیچھے نہ ہو لے وہ میرے لائق نہیں۔ جو بھی اپنی جان کو بچائے وہ اُسے کھو دے گا، لیکن جو اپنی جان کو میری خاطر کھو دے وہ اُسے پائے گا۔ (متی 10:28–39)

میری بیوی نے اِن کا مطلب پوچھا۔ مَیں اُسے اِن آیات کا مطلب سمجھا رہا تھا، لیکن باطن میں میرا دل مجھے ملامت کر رہا تھا۔ تب اُس نے مجھ سے کہا، "اگر یہ بات ٹھیک ہے تو ہم سب کو حضرت عیسیٰ کے پیروکار ہو جانا چاہئے۔"

مَیں نے جواب دیا، "مَیں نہیں چاہتا کہ اپنی اولاد پر جبر کروں۔ سب بچوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ اُن کا بیاہ کر دیں گے پھر دیکھا جائے گا۔"

میری بیوی نے کہا، "اولاد سے زیادہ پیاری کیا چیز ہوسکتی ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم خود تو سچّائی کا پیچھا کر کے بہشت میں داخل ہوں اور اپنی اولاد کو مسلمان رہنے دیں اور اُنہیں بہشت سے محروم رکھیں؟ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟"

اُس کی یہ بات سُن کر مَیں تمام رات جاگتا رہا۔ مجھے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ مَیں نے نہایت دل سوزی سے خدا سے دُعا مانگی کہ وہ میری ہدایت کرے اور مجھے اِس تاریک راستے میں اپنا نُور دکھائے تاکہ مَیں جان سکوں کہ مجھے اب کیا قدم اُٹھانا چاہئے۔ مَیں نے جواب ملنے کے لئے انجیل کھولی تو میری نظر اِس آیت پر پڑی،

> اپنی کسی بھی فکر میں اُلجھ کر پریشان نہ ہو جائیں بلکہ ہر حالت میں دُعا اور التجا کر کے اپنی درخواستیں اللہ کے سامنے پیش کریں۔ دھیان رکھیں کہ آپ یہ شکرگزاری کی روح میں کریں۔
> (فلپیوں 4:6)

یہ پڑھ کر مَیں دُعا میں مشغول رہا۔

1906ء جب کرسمس کی چھٹیاں ہوئیں تو برکت علی بٹالہ سے آیا۔ مَیں نے دو چار بار بہت کوشش کی کہ اُسے اپنے دلی راز سے آگاہ کروں، لیکن میرا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ عیسائی ایمان کا جانی دُشمن تھا۔ اگرچہ سکول میں وہ بچپن سے ہر سال کتابِ مقدّس کا انعام حاصل کیا کرتا تھا تو بھی انجیل کے مُنادوں کو بازار میں بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ بلکہ ایک بار تو اُس نے گھر میں انجیل بھی جلا دی تھی۔

اِس بار جب وہ گھر آیا تو وہ بڑی خوشی سے بتانے لگا، "اگرچہ مَیں نے کتابِ مقدّس کا انعام پھر حاصل کیا ہے لیکن اپنے ہیڈ ماسٹر کو انجیل کے کلاس میں سخت تنگ کیا کرتا ہوں۔ سوالات کی بوچھاڑ سے مَیں اُس کا دم ناک میں کر دیتا ہوں۔"

یہ باتیں سُن کر مَیں اورمیری بیوی ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے، اور مَیں نے اُسے کچھ نہ کہا۔ چھٹیوں کے بعد وہ واپس سکول میں چلا گیا۔

جب 1907ء کا شروع ہوا تو میری بیوی نے پھر مجھ سے تقاضا کرکے کہا، "جب آپ کا ایمان ہے کہ مسیح ہی نجات دیتا ہے تو ہم کیوں اپنی اولادسمیت حضرت عیسیٰ کے پیروکار نہ ہو جائیں؟" چنانچہ دُعا کے بعد ہم نے یہی مناسب خیال کیا کہ ہم سب المسیح کے پیروکار ہو جائیں اور برکت علی کو خدا پر چھوڑ دیں۔ ایک روز مَیں ایک مِس صاحبہ کو راہ میں ملا اور اُس سے کہا کہ آپ ہمارے گھر آیا کریں اور ہمارے بچوں کو پڑھایا کریں۔ اِس پر وہ ہمارے گھر آ کر ہماری دونوں لڑکیوں کو پڑھانے لگی۔ جب برادری کے لوگوں نے دیکھا کہ مِس صاحبہ ہمارے گھر میں انجیل پڑھاتی ہے تو تمام محلّے میں کھلبلی مچ گئی اور گپیں شروع ہوگئیں۔

رحمت علی کو نظر آ رہا تھا کہ باپ دادا کے عقیدوں کو چھوڑنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ جہاں تک دُنیا کا تعلّق ہے زندگی ایک بوجھ ہو جائے گی جس کو اُٹھا کر کانٹوں کے جنگل میں چلنا پڑے گا۔ اور کانٹے بھی ببُول کے، جو تلووں میں چُبھ کر اُن پاؤں کو جو اب تک گویا مخمل کے فرش پر چلتے رہے تھے، زخمی کرتے رہیں گے۔ لیکن سچے عقیدے کی راحت اور گُناہوں سے نجات کا آرام کوئی مول مہنگا سودا نہ تھا۔

موروثی اور روایتی عقیدوں کی چار دیواری صرف تقلید ہی کی بُنیادوں پر مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ جب یہ بُنیادیں ہل جاتی ہیں تو ساتھ ہی سکون بھی ہل جاتا ہے۔ متلاشی کو آرام تب ملتا ہے جب وہ سچائی کو حاصل کرتا ہے۔ لیکن اِس منزل تک پہنچنے سے پہلے ایک پُرخار راہ طے کرنی پڑتی ہے۔

وہ ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو اِس درجہ کٹر اور بے لچک تھا کہ بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا کُفر اور زندقہ سمجھتا تھا۔ لیکن اُنھوں نے اب اِس سختی اور جمود سے آزادی پا لی تھی۔ اب درمیانی منزلوں میں رُکنا بھی ناممکن تھا۔ اب دینی سختی اُن کے اور خدا کے درمیان حائل نہیں ہوسکتی تھی۔ آخر یہ زندگی چند روزہ ہے اور یہ دُنیا فانی ہے۔ ؎

> آ جائے ایسے جینے سے اپنا تو جی بھی تنگ   آخر جیئے گا کب تلک اے خضر؟

وہ روحانی زندگی اور خدا کی قُربت کے خواہش مند تھے۔ آخر اُن کے باپ دادا کی دینی تعلیم کا مقصد بھی تو یہی تھا۔ اور کیا خوب کہا گیا ہے کہ ؎

> بہرِ یک گُل زحمتِ صد خارمی باید کشید
> ایک گُلاب کی خاطر سَو خاروں کی زحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔

اُن کی قوم کے افراد آپس میں اُن کے بارے میں چرچا کرنے لگے۔ بعض کہتے تھے کہ نہیں، وہ انجمنِ شیعاں کے صدر ہیں۔ اُنہیں تجارت میں کوئی خسارہ نہیں پڑا۔ وہ عیسائی کیوں ہونے لگے؟ بعض کہتے تھے کہ وہ اپنے وعظوں میں اور نصیحتوں میں قرآن کی باتیں کم کرتے ہیں لیکن کتابِ مقدّس کے نبیوں کی کتاب کا حوالہ زیادہ دیتے ہیں۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ آخر حکیم محمد وارث جو اُن کے مخلص قریبی دوست اور رشتے دار تھے اُن کے پاس آئے تا کہ کُل حالات کا جائزہ لیں۔ شیخ رحمت اللّٰہ لکھتے ہیں،

اُنہوں نے مجھ سے پوچھا، "یہ افواہ جو ہر جگہ اُڑ رہی ہے، اِس کی تہہ میں کیا حقیقت ہے؟"

مَیں نے جواب دیا، "اگر آپ کا مطلب ہے کہ کیا مَیں عیسائی ہونا چاہتا ہوں تو یہ بات دُرست ہے کہ مَیں مسیح پر ایمان رکھتا ہوں۔"

اُنہوں نے کہا، "اچھا مَیں رات کو آؤں گا اور پھر آرام سے گُفتگو کریں گے اور کوئی ہماری باتوں میں خلل بھی نہ ڈالے گا۔"

وہ رات کو آئے، اور ہم دونوں میں آدھی رات تک قرآن و انجیل کے مختلف پہلوؤں پر گُفتگو ہوتی رہی۔ تب اُنہوں نے رُخصت مانگی اور کہا، "انشا اللّٰہ مَیں کل رات کو پھر آؤں گا اور ہر بات پر تفصیل سے اپنے خیالات کا تبادلہ کریں گے۔"

جب وہ پھر رات کو آئے تو ہم دونوں قرآن اور کتابِ مقدّس لے کر بیٹھ گئے۔ گُفتگو کے شروع میں مَیں نے اُن سے کہا، "پہلے ہم خدا سے خلوص دلی سے دُعا کریں کہ خدا ہم دونوں کی راہنمائی کرے اور حق کی تلاش کے سوا ہمارے دلوں میں کوئی خیال اِس وقت جگہ نہ پائے۔

تب ہم خدا ہم کو غور کرنے کی توفیق دے گا اور ہم ٹھیک معلوم کرسکیں گے کہ سیدھی راہ کون سی ہے۔" ہم نے دُعا کے لئے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھائے اور دُعا کی کہ یا اللہ العالمین، تُو ہماری آنکھوں کو کھول۔ پھر ہم نہایت سنجیدگی سے رات بھر گُفتگو کرتے رہے۔

مُرغ کی بانگ پر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے، "مَیں اب یہ تسلیم کرتا ہوں کہ انجیل کلامِ الٰہی ہے اور آپ راستی کی تلاش کرکے اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عیسائی دین راستی پر ہے۔ میرا بھی آپ سے بہت باتوں میں اتّفاق نظر آتا ہے۔ لیکن مَیں ابھی یہ کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے جب تک مَیں بھی آپ کی طرح خوب اچھی طرح سے پتہ نہ کرلوں۔" اِتنے میں صبح کا ستارہ نمودار ہوگیا اور وہ گھر چلے گئے۔ اِس کے بعد ہم ہر روز شام کے وقت باغ کی طرف سَیر کو نکل جانے لگے اور اسلام اور عیسائی دین کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔

حکیم محمد وارث مجھے بتایا کرتے تھے،

ایک دن ہم دونوں تقریباً شام کو 5 بجے باغ کی طرف نکل گئے اور حسبِ دستور اسلام اور عیسائی ایمان پر باتیں کرتے رہے۔ جب مَیں نے دیکھا کہ شیخ صاحب کا انجیل پر ایمان پکّا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی عیسائی دین سے نہیں ہٹیں گے تو مَیں نے اُنہیں کہا کہ بھائی جی، آپ کا موجودہ رویّہ دُرست نہیں ہے۔ قرآن کی رو سے یہ رویّہ منافقانہ ہے، اور انجیل کی رُو سے آپ اِس کو کسی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دے سکتے۔ آپ اپنی دو ٹانگیں دو کشتیوں میں جو مخالف سمتوں کو جا رہی ہوں، رکھ کر دریا پار نہیں کرسکتے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ یا تو اسلام کے فرماں بردار ہوکر رہیں یا مسیح کا سب کے سامنے اقرار کریں جیسا بھائی احسان نے کیا تھا۔

اِس پر وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئے۔ مَیں اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ تھرّا کر اُٹھے اور سخت کانپنے لگے۔ اگرچہ ابھی گرمی کا موسم نہ تھا لیکن اُن کے روئیں روئیں سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ اُن کی حالت متغیّر ہوگئی۔ اُن کے آنسو بہنے لگے اور نہایت بے قراری کی حالت میں

اُنہوں نے ڈھائیں مار کر کہا، "ہائے، مجھ سے مسیح کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اُس نے بھی فرمایا ہے کہ

> جو بھی لوگوں کے سامنے میرا اقرار کرے اُس کا اقرار مَیں خود بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے کروں گا۔ لیکن جو بھی لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے اُس کا مَیں بھی اپنے آسمانی باپ کے سامنے انکار کروں گا۔ (متی 10:32–33)

اور اُس کا رسول بھی کہتا ہے،

> اگر تُو اپنے منہ سے اقرار کرے کہ عیسیٰ خداوند ہے اور دل سے ایمان لائے کہ اللہ نے اُسے مُردوں میں سے زندہ کر دیا تو تجھے نجات ملے گی۔ (رومیوں 10:9)

مَیں نے اُنہیں کہا، "بس، پھر تو معاملہ صاف ہے۔"

اُنہوں نے جواب دیا، "اچھا، اب مَیں سب کے سامنے علانیہ اقرار کروں گا کہ میرا ایمان مسیح پر ہے۔"

مَیں نے اُنہیں حوصلہ دلا کر تسلّی دی اور کہا، "خواہ تمام دُنیا آپ کے خلاف ہو جائے مَیں کبھی آپ کے اور آپ کے خاندان کے خلاف نہیں ہوں گا۔ مَیں آپ کا ہمیشہ مخلص دوست بن کر رہوں گا اور انشا اللہ آپ کا ساتھ دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

شیخ رحمت اللہ لکھتے ہیں،

جب ہم دونوں شہر کی جانب واپس آئے تو اُس نے میرے رشتے داروں کو خبر دی کہ مَیں علانیہ بپتسمہ پا کر حضرت عیسیٰ کا پیروکار ہونا چاہتا ہوں۔ یہ خبر آناً فاناً محلّے کے لوگوں میں پھیل گئی۔ اگلے روز میرے تین رشتے داروں نے مجھے پیغام بھیجا کہ ہم تینوں آج رات آپ کے پاس آئیں گے۔ جب شام ہوئی تو میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ بے قراری اور بے چَینی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میری حالت تہہ و بالا ہونے لگی۔ تب مَیں اُٹھا اور

گھر کی چھت پر جا کر خدا کے حضور گڑگڑا کر دُعا مانگنے لگا کہ "اے بے چارگان کے والی۔ اِس وقت تُو میرا چارہ کر۔ مجھے طاقت اور قوّت دے۔ اَے مسیح، تُو نے کہا ہے کہ

> تمہارا دل نہ گھبرائے۔ تم اللّٰہ پر ایمان رکھتے ہو، مجھ پر بھی ایمان رکھو۔ (یوحنا 1:14)

اب مَیں تجھ پر ہی ایمان لے آیا ہوں۔ تُو مجھے اپنا اطمینان بخش۔ مَیں لاچار ہوں۔ تُو میری مدد کر۔ تُو میری زبان کو لے اور اِس کے ذریعے آج رات تُو ہی اِن لوگوں سے کلام کر۔"

مَیں دیر تک اوندھا پڑا رہا۔ دُعا کے بعد میرے دل میں عجیب اطمینان پیدا ہو گیا۔ جب مَیں نیچے اُترا تو میرے رشتے دار آ گئے تھے۔ مَیں نے قرآن اور کتابِ مقدّس کو اپنے پاس رکھ لیا۔ چراغ دان پر دِیا رکھا اور حُقّہ اُن کے سامنے پیش کیا۔ چُھٹتے ہی ایک نے یہ سوال کیا، "اگر تورات اور انجیل سب خدا کا کلام ہیں تو جو چیزیں تورات میں حرام ہیں وہ عیسائی دین میں کیوں جائز قرار دی گئی ہیں؟"

مَیں نے قرآن لیا اور تیسرے پارہ میں سورہ عمران کی 50 آیت نکال کر اُن کے رو برو رکھ دی جس میں مسیح کا قَول لکھا ہے،

> وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ-
>
> اور مجھ سے پہلے جو تورات (نازل ہوئی) تھی اُس کی تصدیق بھی کرتا ہوں اور (مَیں) اِس لیے بھی (آیا ہوں) کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام تھیں اُن کو تمہارے لیے حلال کر دوں اور مَیں تو تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

اِس آیت پر چند منٹوں کے لئے بحث ہوتی رہی۔ پھر مَیں نے کہا، "بھائیو، یہ جُزوی باتیں چھوڑو اور کتابِ مقدّس کی اصل بُنیادی باتوں پر گُفتگو کرو۔"

اُنہوں نے کہا، "جب کتابِ مقدّس محرّف ہے اور قابلِ اعتبار ہی نہیں رہی تو ہم اِس کی سند کس طرح قبول کر سکتے ہیں؟"

مَیں نے قرآن میں سے وہ تمام آیات نکال کر اُن کے سامنے رکھ دیں جن میں قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ کتابِ مقدّس کی تصدیق کرتا ہے اور اُسے امام، نور اور ہدایت قرار دے کر کہتا ہے کہ ہر مومن کے لئے لازم ہے کہ اِس پر ایمان رکھے۔

اُنہوں نے کہا، "یہ باتیں اصل تورات اور انجیل کے بارے میں لکھی ہیں جو تحریف ہونے سے پہلے اہلِ کتاب کے ہاتھوں میں تھیں۔"

مَیں نے جواب دیا، "حضرت عیسیٰ مسیح کے سَوا چھ سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد یہ باتیں قرآن میں لکھی گئیں، اور اِس کے سَوا چھ سو سال کے عرصے میں تورات و انجیل ہزاروں بار ہر صدی اور ہر ملک میں نقل ہوتی رہی۔ اِن قدیم صدیوں کے نُسخے اب تک موجود ہیں جو موجودہ کتابِ مقدّس کے مطابق ہیں۔ اِس کے علاوہ کتابِ مقدّس کے صحائف کا ترجمہ بہت سے ملکوں کی زبانوں میں اِن سوا چھ سو سال میں ہوا تھا۔ اُن قدیم ترجموں کے نُسخے بھی موجود ہیں جو موجودہ کتابِ مقدّس کے مطابق ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اِس کتابِ مقدّس میں جو آپ کے سامنے پڑی ہے کسی قسم کی تحریف واقع نہیں ہوئی۔"

اُنہوں نے پوچھا کہ آپ کو اِن نُسخوں کا علم کیسے ہو گیا ؟

تب مَیں نے اُنہیں فینڈر کی کتاب میزان الحق دکھائی جو بھائی احسان اللّٰہ نے بہت سال ہوئے مجھے مطالعے کے لئے دی تھی۔ بحث ساری رات جاری رہی۔ جب مُرغ نے بانگ دی تو وہ اپنے گھروں کو رُخصت ہو گئے۔ لیکن یہ کہتے گئے کہ اگر آپ اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو آپ کا بھائی احسان سے بھی زیادہ بُرا حال ہو گا۔ کیونکہ وہ تو غیرشادی شُدہ تھے، اور آپ بیوی بچوں والے ہیں۔ آپ نہ صرف اپنے رشتے داروں کو کھو بیٹھیں گے اور برادری سے خارج کئے جائیں گے بلکہ آپ اور آپ کے بچے بھوکوں مریں گے۔ آپ سے کوئی شخص سودا نہیں لے گا اور نہ کسی قسم کا واسطہ رکھے گا۔ کیا آپ کو فارسی کا مصرع یاد نہیں کہ ؎

> روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتواں کرد۔
> تُو دن رات خدا کے لوگوں سے لڑ نہیں سکتا

مَیں نے جواب دیا ؎

> عشق از ایں بسیار کردست و کند
> عشق نے اِس سے زیادہ کیا ہے اور کرتا ہے

اُنہوں نے کہا، یاد رکھو کہ ؎

> مردِ آخربین مبارک بندہ ایست
> انجام پر نظر رکھنے والا مبارک ہے

مَیں نے کہا، "تب ہی تو مجھے آخرت کا خیال دامن گیر ہے۔ اور مَیں دُنیا کو ترک کر رہا ہوں۔"
اُنہوں نے کہا، "آخر اِس کا انجام کیا ہو گا ؟"
مَیں نے جواب دیا ؎

> کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست   ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید
> کون نہیں جانتا کہ منزلِ مقصود کہاں ہے؟ یوں ہے کہ گھنٹے کی آواز آتی ہے۔

وہ کہنے لگے، "آپ ابھی ماشا اللہ جوان ہیں۔ ساری عُمر آپ کے سامنے پڑی ہے۔ کیا اِس کو روتے ہی گُزارو گے؟"
مَیں نے مُسکرا کر جواب دیا ؎

> ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ   دُنیا سے گُزرنا، سفر ایسا ہے کہاں کا ؟

پپتسمہ اور یگانوں کا دباؤ

رحمت علی نے اپریل 1907ء کے شروع میں اپنے بھائی احسان اللہ کو خط لکھ کر تمام حالات کی اطلاع دی۔ یہ بھی بتایا کہ اب مَیں مسیح کا علانیہ اقرار کر کے پپتسمہ پانا چاہتا ہوں۔

یہ خط پاتے ہی احسان اللہ نارووال کی جانب چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر وہ سیدھے اپنے آبائی مکان کو گئے اور بھائی سے بغل گیر ہوئے۔ اُنہیں دیکھ کر رحمت علی کے دل کو تسلّی ہوئی۔ بڑے بھائی کی موجودگی نے اُنہیں حوصلہ دیا۔ میاں صاحب اُن کے پاس چھ ہفتے رہے اور اُن کے ایمان کو تقویّت دیتے رہے۔ اُنہوں نے قوم کے بزرگوں اور رشتے داروں سے مل کر اُنہیں بہتیرا سمجھایا، لیکن وہ ایک نہ مانے۔ ہر طرف سے دھمکیوں اور لعن طعن کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُن کے بھائی نے دھمکیوں کے جواب میں کہا،

> اوکھلی میں سر دیا تو دھمکیوں سے کیا ڈر؟

1907ء میں عیدِ پنتکُست کے روز رحمت علی نے اپنی بیوی، دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سمیت اپنے بھائی احسان اللہ کے ہاتھوں سے بپتسمہ پایا۔ اُن کا عیسائی نام رحمت اللہ رکھا گیا۔ بپتسمے کا پانا تھا کہ چاروں طرف سے مصیبتوں کا پہاڑ اُن پر ٹوٹ پڑا۔ اپنے یگانے سب بے گانے ہو گئے۔ برادری نے اُنہیں خارج کر دیا۔ بازار کے دُکان داروں نے سودا دینے سے انکار کر دیا۔ چاروں طرف سے لعنت و پھٹکار کے آوازے کسے جانے لگے۔ جو لوگ پہلے اپنی انجُمن کے صدر سے ہم کلام ہونا باعثِ شرف خیال کرتے تھے اب وہی علانیہ گلیوں میں اُن کے مُنہ پر صلواتیں سُنانے لگے۔ شہر کے لونڈے اُن کے گھر کے سامنے قطار باندھ کر اُنہیں گندی گالیاں دیتے۔ محلّے کی عورتیں واویلا کرتیں۔ جب وہ یا اُن کی اہلیہ گلی میں سے گُزرتے تو اپنے مکانوں سے اُن کے سروں پر راکھ اور کوڑا کرکٹ پھینک دیتیں۔ مسلمان دھوبی نے کپڑے دھونے سے انکار کر دیا۔ سقّے نے پانی بھرنا بند کر دیا، اور وہ روٹی پکانے کو محتاج ہو گئے۔ دو دن گھر میں جو اچار، مُربّہ وغیرہ پڑا تھا، وہی کھاتے رہے۔ آخر پڑوس کی ایک عورت رات کے وقت پانی کے ایک دو گھڑے لانے پر رضامند ہو گئی۔

زندگی میں پہلی بار ہندوؤں کی دُکانوں سے سودا آیا۔ غرض، مُسلمانوں نے ہر ممکن طریقے سے اپنے سابق صدرِ انجمن کا قافیہ تنگ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن خدا نے ہر بات میں اپنے بندے کی مدد کی۔

شیخ رحمت اللہ اپنی برادری کے لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ ناجائز دباؤ اُنہیں کسی طرح خداوند کی راہ سے دور نہیں کر سکے گا۔ پولس رسول کی بات اُنہیں سُناتے تھے کہ

> کون ہمیں مسیح کی محبت سے جدا کرے گا ؟ کیا کوئی مصیبت، تنگی، ایذا رسانی، کال، ننگا پن، خطرہ یا تلوار؟... مسیح ہمارے ساتھ ہے اور ہم سے محبت رکھتا ہے۔ اُس کے وسیلے سے ہم اِن سب خطروں کے رُوبرُو زبردست فتح پاتے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اُس کی محبت سے کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی: نہ موت اور نہ زندگی، نہ فرشتے اور نہ حکمران، نہ حال اور نہ مستقبل، نہ طاقتیں، نہ نشیب اور نہ فراز، نہ کوئی اَور مخلوق ہمیں اللہ کی اُس محبت سے جدا کر سکے گی جو ہمیں ہمارے خداوند مسیح عیسیٰ میں حاصل ہے۔ (رومیوں 8:35،37–39)

میاں صاحب ایک ہفتے کے قیام کے بعد اپنے بھائی کی لڑکیوں بی بی اللہ دِتّی اور برکت بی بی جن کی عُمر اٹھارہ سال اور گیارہ سال تھی، اپنے ساتھ لے گئے تاکہ اُنہیں پٹھان کوٹ مِس کیمبیل کے سکول میں داخل کر دیں۔ شیخ صاحب کے دو بیٹے عنایت اللہ اور نعمت اللہ جو آٹھ سال اور چار سال کے تھے نارووال کے سکول میں پہلے ہی داخل تھے۔

بیٹے برکت اللہ کی ایمان تک راہ

شیخ رحمت اللہ کے بپتسمہ پانے کے تقریباً تین ہفتے بعد مَیں جو اُن کا بڑا بیٹا تھا گرمیوں کی چھٹیاں کاٹنے کے لئے گھر آیا۔ مجھے والدین کے مسیح ہونے کی خبر نہ دی گئی تھی۔ محلّے کے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرکے باپ کے خلاف سازشیں کھڑی کر رہے تھے۔ اُنہوں نے چچا مُحسن علی کو بُلایا اور اُسے اُکسایا کہ جائیداد کے لئے مقدّمہ کرے۔ چچا مُحسن علی نہایت کٹر شیعہ تھے۔ لیکن باپ نے اُنہیں بچپن سے پالا تھا، سکول کے اخراجات برداشت کئے تھے، شادی کر دی تھی، اُن کے بچوں کو پالا پوسا تھا، پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی کر دی تھی اور دوسری بیوی کے پہلے بچوں کو بھی پال رہے تھے۔ مُحسن علی یہ احسان کبھی بھول نہیں سکتے تھے۔ اُنہوں نے مقدّمہ تو نہ کیا، لیکن جائیداد کی تقسیم

پر ضِد کر کے باپ کو کہنے لگے، "جس طرح برکت علی آپ کا بیٹا ہے مَیں بھی آپ کا بیٹا ہوں۔" وہ نصف جائیداد پر اصرار کرنے لگے۔

جواب میں باپ نے تمام قابلِ انتقال اشیا، چاندی سونے کے زیورات، گھر کا سامان، یہاں تک کہ آٹا دال تک کا آدھا حصّہ اُنہیں دے دیا۔ اب شیخ صاحب پولس رسول کے الفاظ کا مطلب سمجھے،

> اُس وقت یہ سب کچھ میرے نزدیک نفع کا باعث تھا، لیکن اب مَیں اِسے مسیح میں ہونے کے باعث نقصان ہی سمجھتا ہوں۔ ہاں، بلکہ مَیں سب کچھ اِس عظیم ترین بات کے سبب سے نقصان سمجھتا ہوں کہ مَیں اپنے خداوند مسیح عیسیٰ کو جانتا ہوں۔ اُسی کی خاطر مجھے تمام چیزوں کا نقصان پہنچا ہے۔ مَیں اُنہیں کُوڑا ہی سمجھتا ہوں تاکہ مسیح کو حاصل کروں اور اُس میں پایا جاؤں۔ (فلپّیوں 3:7–9)

محلّے کے لوگوں نے دوسری چال یہ چلی کہ چچا کو کہنے لگے، "اب رحمت علی عیسائی ہو گیا ہے، اِس لئے اُسے وراثت کا حق حاصل نہیں۔ جس مکان میں وہ رہتا ہے آبائی ہے؛ اُسے نکال باہر کرو، پھر دیکھیں گے کہ اُسے کون رہائشی مکان دے گا۔" جواب میں باپ نے اُسے اِس ایک مکان کے عوض پانچ مکان دے دیئے اور تین دُکانوں میں سے دو دُکانیں اُسے دے دیں تاکہ اُن کرایوں سے اُس کے اور اُس کی بیوی کے بچوں کی پرورش ہو جائے۔

جب محلّے والوں نے دیکھا کہ یہ چال بھی کارگر نہ ہوئی تو تیسری چال وہ یہ چلے کہ چچا مُحسن علی کو کہا، "باپ اور بیٹے میں جُدائی ڈال دو اور برکت علی کو اپنے پاس رکھ لو۔" کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ مجھے چچا سے بہت محبّت ہے۔ جب مَیں آیا تو وہ مجھے کہنے لگے، "بھائی جی تو کافر ہو گئے ہیں۔ کسی مومن کو روا نہیں کہ وہ کافر کے ساتھ رہے۔ اب تم میرے ساتھ رہو، کیونکہ اُن کے ساتھ کھانا کھانا بھی حرام ہے۔"

مَیں نے جواب دیا، ''مَیں یہ ہرگز نہ کروں گا۔ وہ کافر نہیں بلکہ اہلِ کتاب ہیں۔ اُن کے ساتھ رہنا اور کھانا کھانا جائز ہے۔ مَیں عیسائی نہیں ہوں گا، لیکن مَیں اُن کا ساتھ ایسے آڑے وقت میں کبھی نہ چھوڑوں گا جب سب لوگ اور آپ بھی اُن کے مخالف ہو گئے ہیں۔''

میرے چچا دین کے معاملے میں ہمیشہ میرے ہادی رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے ایک کتاب دی اور کہا، ''اِس کا غور سے مطالعہ کرنا۔ یہ تم پر کتابِ مقدّس کی خامیاں ظاہر کر دے گی۔ مذہبی امور میں بھائی جی کی باتیں نہ سُننا۔''

اِس رسالے کا نام زُبدَۃ الاَقاویل تھا جس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کتابِ مقدّس خدا کا اصلی کلام نہیں بلکہ محرّف ہے۔ آخری حصّے میں پیش کر دیا گیا تھا کہ قرآن کی تعلیم کی نسبت انجیل کی تعلیم ناقص ہے۔ کیونکہ اُس احکام پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

جب مخالفین نے دیکھا کہ یہ چال کارگر نہیں ہوئی تو وہ ایک اَور چال چلے۔ اگلے روز اُنہوں نے قوم کے چند سربراہوں کو میرے ہونے والے سُسر شیخ غلام صادق کی دُکان پر اکٹھا کر کے مجھے بُلا بھیجا۔ شیخ غلام صادق کہنے لگا، ''دیکھ تُو میرا بیٹا ہے۔ مَیں تیرے تمام اخراجات کا حامل ہوں گا اور تجھے ایم۔ اے تک تعلیم دلواؤں گا۔ تُو میرے پاس چلا آ۔ تیرا باپ تو لالچ کے مارے عیسائی ہو گیا ہے۔''

سب لوگوں نے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ مَیں نے جواب دیا، ''آپ خود جانتے ہیں کہ تمام قوم میں باپ جیسا نیک اور پارسا شخص نہیں ہے۔ آپ اُن پر لالچ کی تُہمت لگاتے ہیں، جو سالوں سے آپ کا صدرِ انجُمن رہا ہے اور راست گوئی، دیانت داری، مزاج کی سنجیدگی اور غربا پروری میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اگر اُنہیں لالچ ہوتا تو کیا وہ اپنی جائیداد کی ایسی تقسیم کرتے؟ آپ ہی خدا لگتی بات کریں۔ آپ میرے تایا جی کے بارے میں بھی کہا کرتے تھے کہ وہ لالچ کے مارے عیسائی ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ کے سامنے اُنہوں نے دُنیا پر لات ماری اور فقیر ہو گئے۔ کیا حِرص اِسی کو کہتے ہیں؟ ہاں، آپ لوگ مجھے لالچ دے رہے ہیں تاکہ مَیں اُن سے جُدا ہو جاؤں۔ مگر مَیں آپ سب کو چھوڑ دوں گا۔ لیکن اُنہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا اور اسلام کو بھی ترک نہیں کروں گا جب تک عیسائی ایمان کی صداقت مجھ پر ظاہر نہ ہو جائے۔''

جب مَیں گھر آیا تو مَیں نے باپ سے اُن باتوں کا ذکر کیا جو چچا مُحسن علی نے اور غلام صادق نے مجھے کہی تھی۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ بہتر ہو گا کہ تم قرآن و انجیل کا مقابلہ کرکے خود دیکھو۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہے،

> سب کچھ پرکھ کر وہ تھامے رکھیں جو اچھا ہے۔ (1 تھِسلُنیکیوں 21:5)

اُن کے انتظام کے مطابق مَیں جون کی کڑکتی دُھوپ میں وہاں کے انگریز خادم کے پاس گیا۔ اُنہوں نے کہا، "ہم متّی کی انجیل پڑھنی شروع کریں گے۔"

مَیں نے جواب دیا، "مَیں اناجیل کے مضامین سے خوب واقف ہوں اور اِس کے بہت سے مقامات مجھے حِفظ ہیں۔ آپ میرے اعتراضات رفع کریں۔" یہ کہہ کر مَیں نے زُبدَۃ الاَقاویل کو کھول کر بہت سے اعتراضات پیش کر دیئے۔

اُن کو نہ قرآن سے واقفیّت تھی اور نہ اسلام کے اصولوں کا علم تھا۔ نہ وہ متناقص مقامات کے جواب دے سکے۔ سب سے بڑی دلیل اُنہوں نے یہ دی کہ عیسائی مذہب حق ہے، کیونکہ سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا اور یہ سلطنت عیسائی ہے۔ وہ بے چارے نِرے انگریز تھے جو حکومت کے نشے میں سرشار تھے۔ غرور اُن کی رفتار سے ٹپکتی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد مَیں نے اُن سے کہا، "مَیں کل سے نہیں آؤں گا، کیونکہ دُھوپ میں ڈھائی میل آتا جاتا ہوں۔ آپ نے کبھی پانی تک نہ پلایا، اور نہ آپ میرے کسی اعتراض کا جواب دینے کے اہل ثابت ہوئے ہیں۔"

مَیں نے یہی بات باپ سے کہی۔ اُنہوں نے مجھے میزان الحق اور مزید کئی ایک کتابیں دے کر کہا، "یہ کتابیں تمہاری مُشکلات کو حل کرسکیں گی۔" مَیں اِن کتابوں کا غور سے دن رات مطالعہ کرتا رہا۔ میرے چچا اپنے کام پر واپس چلے گئے تھے۔ اُن کی غیر حاضری میں مولوی حشمت علی آئے ہوئے تھے۔ مَیں اُن کے پاس گیا، لیکن وہ بے چارے عیسائی دین کے علوم سے کورے تھے اور اِن مختلف کتابوں کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے۔ کیونکہ وہ صرف شیعہ مذہب سے سطحی طور پر ہی واقف

تھے، اور اِن کتابوں میں شیعہ اور اہلِ سُنت کی مستند کتابوں کے حوالے تھے۔ مَیں نے حکیم محمد وارث اور قوم کے سربراہوں سے اِن کتابوں کے اعتراضوں کا ذکر کیا، لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ لاچار مَیں اِن کتابوں کے مضامین کی روشنی میں اپنے اعتراضات اور زُبدَۃ الاَقاویل کے اعتراضات پر غور کرنے لگا۔

جوں جوں مَیں مطالعہ کرتا گیا مجھ پر یہ ظاہر ہوتا گیا کہ انجیل محرّف نہیں ہے اور کہ از رُوئے قرآن پیغمبرِ اسلام قیامت کے روز گُناہ گاروں کی شفاعت اور سفارش نہیں کرسکیں گے۔ قرآن کے مطابق وہ صرف عرب کے رسول ہوکر دیگر انبیا کی طرح بھیجے گئے تھے اور جہان کو نجات نہیں دے سکتے۔ انجیل کی تعلیم روحانی ہے۔ قرآن ایک اخلاقی کتاب ہے جو کسی شخص کو ہدایت تو دے سکتی ہے لیکن گُناہوں کے پنجے سے نہیں چُھڑا سکتی۔ آخر مَیں نے باپ سے کہا، "مَیں بھی مسیح کا پیروکار ہونے کو تیار ہوں۔"

وہ بہت خوش ہوئے اور کہا، "خدا کا شکر ہو جس نے ہم سب پر رحم کیا ہے اور سب کو نورِ ایمان عطا کیا ہے۔"

میرا بپتسمہ بھی 1907ء میں ہوا۔ میرا عیسائی نام برکت اللہ رکھا گیا۔ جب مَیں بپتسمہ پا کر عبادت گاہ سے باہر نکلا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مَیں گویا ہَوا میں چل کود رہا ہوں۔ کیونکہ گُناہوں کے بوجھ کا احساس جو مجھے ستاتا رہتا تھا جاتا رہا، اور اُس کی جگہ خوشی، چَین اور اطمینان نے میرے دل میں جگہ لے لی۔ اِس عجیب تجربے کو مَیں زندگی کے آخر تک نہیں بھول سکتا۔ بپتسمہ پانے کے تین روز بعد مَیں واپس بٹالہ چلا گیا۔

مخالفین کا آخری حربہ زیادہ کام یاب رہا۔ ہمارے عیسائی ہونے کے چند ماہ بعد سیالکوٹ کے حاکمِ ضلع نے انگریز پادری کو میونسپل کمیٹی کا صدر بنا دیا تھا۔ قوم کا ایک فرد سیکرٹری تھا۔ اُس نے پادری کو "حضور، خداوند، آقا، مالک" کہہ کہہ کر اپنے ہاتھوں پر چڑھا لیا۔ پھر باپ پر میونسپل ایکٹ کے ماتحت دو تین مقدّمے کرکے کہا کہ اگر آپ نے رحمت اللہ کی حمایت کی تو آپ منصف مزاج نہ ہوں گے۔ انگریز قوم انصاف کے لئے مشہور ہے۔ پادری اردو جانتا نہ تھا اور نہ بہت پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اُس نے

کاغذات پر دست خط کر دیئے اور مقدّمات دائر ہو گئے جس سے باپ کو بڑی پریشانی اُٹھانی پڑی۔ یوں اُنہیں مسلمانوں سے بڑھ کر ایک عیسائی خادم الدین کے ہاتھوں زیادہ ایذا پہنچی۔ ؎

> من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم   کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد
>
> مَیں بیگانوں کے بارے میں ہرگز شکایت نہیں کر رہا
>
> کیونکہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ میرا جاننے والا کر رہا ہے۔

رحمت اللہ کی محبت کا غلبہ

پتسمہ پانے سے پہلے کا ذکر ہے جب تک مَیں گھر میں رہا۔ ہمارے مکان پر برادری نے شہر کے غُنڈوں کا پہرا لگا دیا تھا تاکہ نہ کوئی ہم کو ملنے آئے اور نہ پانی بھرے۔ مَیں زنانہ مشن کے احاطے سے دو تین مرتبہ پانی کا ایک گھڑا اور ایک بالٹی لے آتا تھا۔ لیکن گرمیوں کے دنوں میں ہمسائی کا ایک گھڑا پانی اور میرا لایا ہوا پانی کِس طرح کافی ہو سکتا تھا۔ تو بھی گُزارہ ہوتا گیا۔ میرے بٹالہ آنے کے بعد پانی بھرنے کی مُشکل بڑھ گئی۔ پرمانند صاحب لکھتے ہیں،

رحمت اللہ پر پانی کی وجہ سے سخت مُصیبت آئی۔ ہوتے ہوتے یہ خبر انگریز خادم تک پہنچی۔ اُس نے قوم کے لوگوں کو بہت سمجھایا، لیکن چونکہ وہ ابھی صدر نہیں بنا تھا اُس کی کسی نے نہ مانی۔ آخر اُس نے اُن کے باپ کو بتائے بغیر سیالکوٹ ڈپٹی کمشنر کو لکھا۔ ڈپٹی کمشنر خود نارووال آیا، اور اُس نے سب کو بُلایا۔ جب اُن کے باپ کو یہ پتا چلا کہ خادم نے ڈپٹی کمشنر کو بُلا بھیجا ہے تو اُنھوں نے بہت بُرا مانا۔ کیونکہ وہ مسیح خداوند کی خاطر ہر قسم کی ایذا خوشی اور صبر سے برداشت کرنا چاہتے تھے تاکہ اُن کے صبر کا اثر قوم پر ہو۔ خیر، جب سب جمع ہوئے تو حاکمِ ضلع نے تمام باتوں کو دریافت کر کے کہا کہ ملک کے قانون کے مطابق مذہب کی تبدیلی سے سابق حقوق زائل نہیں ہو جاتے۔ اِس واسطے میاں رحمت اللہ کا حق ہے کہ جس کنوئیں سے وہ پہلے پانی لیتے تھے اُسی کُنوئیں سے اب بھی لیں۔

یہ بات قوم کے لوگوں کے لئے مُشکل تھی، کیونکہ وہ کُنواں بڑی مسجد کا کُنواں تھا۔ تب اُس نے میاں صاحب کو کہا، "بالٹی لاؤ اور میرے سامنے کُنوئیں سے پانی نکالو۔"

تب اُن کے باپ کھڑے ہو گئے اور قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، "بھائیو، مَیں نے صاحب ڈپٹی کمشنر کے آگے شکایت نہیں کی اور نہ مجھے یہ خبر تھی کہ وہ آئیں گے۔ کیونکہ مَیں مسیح خداوند کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے ایمان کے لئے دُکھ اُٹھانا چاہتا تھا۔ اور مَیں رسولوں کی طرح خدا کا شُکر کرتا تھا کہ مَیں اِس لائق ٹھہرا کہ خداوند کے نام کی خاطر بے عزّت کیا جاؤں۔ بازاروں اور گلیوں میں لعنت و پھٹکار کی آوازیں میرے لئے فخر کا باعث تھیں۔ آپ کا اِس میں قصور بھی نہیں، کیونکہ آپ اِس خیال سے یہ سب باتیں کر رہے ہیں کہ آپ خدا کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی شریعت کے شکنجے نے یہ سب پیچ گھمائے ہیں اور میرا مکمل قطعِ تعلق کر دیا ہے۔ لیکن اب آپ نے خود اپنے کانوں سے حاکمِ ضلع کے حُکم کو سُن لیا ہے کہ جو میرا حق ہے وہ آپ مجھ سے قانوناً چھین نہیں سکتے۔ مَیں نے آپ کو یہی سمجھایا لیکن آپ نے نہ ماننا تھا اور نہ مانے، حالانکہ گرمی کے سبب سے ہم پیاسے رہے۔ آپ نے میرے گھر کو کربلا بنا دیا۔ یزید کی طرح آپ میرے بچوں کو روٹی پانی کے بغیر بلکتے دیکھتے رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب یہ کُنواں جس میں سے پانی نکالنا میرا حق ہے مسجد کا کُنواں ہے۔ اگر مَیں نے اپنا حق استعمال کر کے اُس میں سے پانی نکالا تو آپ کے خیال کے مطابق یہ پلید ہو جائے گا اور آپ اُس میں سے پانی نہیں بھریں گے۔ آپ کے بچوں کی بھوک پیاس کا وہی حال ہو جائے گا جو ہمارا ہو رہا ہے اور مَیں یہ بات ہرگز نہیں چاہتا۔ کیونکہ میرے خداوند کا حکم ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی اُن کے ساتھ کرو۔ مَیں خوشی سے اپنے حق سے سب کے رو برو دست بردار ہوتا ہوں۔ میری عرض صرف یہ ہے کہ آپ سقّے کو میرے گھر میں پہلے کی طرح پانی بھرنے دیں۔ وہ دوسرے عیسائیوں کے گھروں میں بھی تو پانی بھرتا ہے۔"

اِن باتوں کوسُن کرسب خاموش ہوگئے۔ پھر اُن کا سربراہ لیڈر اپنا سر نیچا کرکے بولا، ''بھائی رحمت علی۔ آپ نے ہماری عزّت رکھ لی۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آئندہ آپ کو روٹی پانی کے معاملے میں کوئی رُکاوٹ نہ ہو گی۔ لیکن آپ برادری سے خارج رہیں گے۔''

یوں میاں رحمت اللہ کے الفاظ نے محلّے کی فضا کو بدل دیا اور گلی گلی میں لوگ یہی کہتے سُنائی دیئے کہ رحمت علی نے ہماری لاج اور ہمارے مذہب کی لاج رکھ لی ہے۔ خدا کا کلام میاں جی کے حق میں پورا ہوا کہ

> ازلی خدا تیری پناہ گاہ ہے، وہ اپنے ازلی بازو تیرے نیچے پھیلائے رکھتا ہے۔ (استثنا 27:33)

رفتہ رفتہ حالات نے پلٹا کھایا۔ میاں جی کی محبّت سب رُکاوٹوں پر غالب آئی۔ ایک دو سال کے اندر سب چھوٹے بڑے اُن کی بے ریا زندگی، خلوص دلی، راست رَوی اورمحبّت بھری زندگی کی وجہ سے اُن کی حد سے زیادہ عزّت کرنے لگے۔

مجھے نارووال گئے کوئی تین سال گُزرے تھے کہ ہاؤس ٹیکس کی کمیٹی بنائی گئی جس میں سب مذہبوں کے نمائندوں کو سب گھروں پر ٹیکس لگا کر بارہ سو روپئے سالانہ جمع کرنا تھا۔ مسلمانوں نے میاں رحمت اللہ کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ جب اُن سے کہا گیا کہ وہ مسلمان نہیں ہے تو اُنہوں نے کہا، ''کوئی ہرج نہیں۔ اُس میں ایک صفت ہے جو ہم کسی اَور میں نہیں پاتے۔ وہ کھری اور بے لاگ سچی بات کرتا ہے۔ کسی کی طرف داری نہیں کرتا اور نہ کسی سے ڈرتا ہے۔ وہ ہمارے حالات سے واقف بھی ہے اورفراخ دل ہے، اور اُس پر ہمارا اعتبار اور بھروسا ہے۔''

یوں میاں صاحب نے اپنے مخلصانہ سلوک اورصبر و محبّت سے اپنے جانی دشمنوں پر فتح پائی۔ وہ جس قدر کم گو اورنرم گو تھے اُسی قدر اُن کی زبان میں اثر تھا۔ لوگ خودبخود اُن کی طرف کِھنچے چلے آتے تھے۔ اگرچہ اُن کی طبیعت میں نرمی تھی، لیکن وہ ارادے کے پکّے تھے۔ چنانچہ 50 برس سے زائد عُمر میں اُنہوں نے یک لخت حُقّے کا استعمال ترک کر دیا حالانکہ وہ حُقّے کے

اِس قدر عادی تھے کہ اُن کی اہلیہ صبح کے وقت اُنہیں جگانے سے پہلے حُقّہ تیار کرکے اُن کے مُنہ کے پاس رکھ دیا کرتیں۔ کیونکہ حُقّے کے کش لینے کے بعد اُن کے جسم میں دم پھرا کرتا تھا۔

جھوٹ، گالی گلوچ اور جلی کٹی سُنانے سے اُنہیں سخت نفرت تھی۔ جو اُن کی صُحبت میں بیٹھتا اُس سے یہ باتیں خود بخود چُھٹ جاتیں۔ اُنہوں نے "ست پرچارک سبھا" قائم کی جس کا جلسہ ہر مہینے میں دو بار ہوا کرتا تھا۔ اُس کی ممبری کی ایک شرط تھی کہ ممبر خود سچ بولے گا اور دوسروں کو سچ بولنے کی تلقین کرے گا۔ اِس سبھا کا ایسا اچھا اثر ہوا کہ لوگ اپنے چھوٹے موٹے مقدّمے اور پیچیدہ معاملے اِس سبھا کے سامنے لانے لگے۔ کیونکہ اُنہیں رحمت اللہ پر اعتبار تھا۔ جب وہ مسلمان تھے تو انجمنِ شیعاں کے صدر تھے، لیکن اب تو وہ تمام نارووال کے صدر ہو گئے۔

جب لوگ اُن سے رفتہ رفتہ سودا مول لینے لگے تو وہ ایک ہی دام مُنہ سے کہتے تھے اور گاہکوں سے ایک پیسہ کم و بیش نہیں لیتے تھے۔ بعض اوقات میرے سامنے ایک آنے پر پچاس ساٹھ روپئے والے گاہک کو موڑ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک زبان اور پورا تول خداوند کو پسند ہے۔ جب رفتہ رفتہ گاہکوں کو اُن کے سچ بولنے کا علم ہو گیا تو اُن کی دُکان چل پڑی اور سینکڑوں روپوں کا مال بغیر کسی تکرار اور مغز خوری کے بِکنے لگا۔

رحمت اللہ کی دُکان کیا تھی، منادی کا اچھا خاصہ مقام تھا۔ جب کبھی مَیں اُدھر سے گُزرتا یہی دیکھتا کہ پانچ سات آدمی اُن کے پاس بیٹھے ہیں، اور وہ اُنہیں انجیل سُنا رہے ہیں۔ جن دنوں میں اُن کا بائیکاٹ تھا، اُس زمانے میں کوئی گاہک تو اُدھر جانے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ اُن کی مالی تباہی کو دیکھ کر مشن والوں نے اُنہیں کہا کہ آپ کلارک آباد کے گاؤں کے مینیجر ہو جائیں۔ لیکن اُنہوں نے یہ بات منظور نہ کی تاکہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ وہ لالچ کی خاطر عیسائی ہو گئے ہیں۔ اُن کا دینی جوش دیکھ کر جماعت والوں نے اُن سے کہا، "آپ خادم الدین بن جائیں۔" لیکن اُنہوں نے آزادانہ تبلیغ کی خدمت کرنے کا تہیّہ کر لیا ہوا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پولس رسول کی طرح دکان داری کرکے انجیل شریف کا پیغام لوگوں کو سُنائیں۔

جب وہ اگست 1912ء میں فوت ہوئے تو اُن کے جنازے کے ساتھ نہ صرف عیسائی تھے بلکہ ہندوؤں، سکھوں، شیعوں اور سُنّیوں کی ایک بھاری تعداد تھی حالانکہ اُس روز بارش ہو رہی تھی۔